ماہ نامہ

ہمدرد نونہال

مارچ ۲۰۲۰ء

مسلسل اشاعت کا ۶۷واں سال
سن آغاز ۱۹۵۳ء

ماہنامہ ہمدرد نونہال

مارچ ۲۰۲۰ء
رجب المرجب ۱۴۴۱ ہجری
شمارہ نمبر ۳ - جلد ۶۸

صدرِ مجلس
سعدیہ راشد

مدیر اعلا
محمد سلیم مغل

معاون مدیر
سلیم فرّخی

کمپوزنگ
محمد اکرم خان

۱۶ویں منزل، بحریہ ٹاؤن ٹاور، طارق روڈ،
پی ای سی ایچ ایس بلاک ۲، کراچی۔
فون: 021-38244000, 38241611 Ext. 1611
ای میل: hfp@hamdardfoundation.org
ویب سائٹ: www.hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ادارۂ سعید: www.hakimsaid.info
فیس بک پیج: /hamdardfoundationpakistan

پبلشر سعدیہ راشد نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر
ادارۂ مطبوعات ہمدرد، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا۔

نونہالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا۔

بہ یاد

شہید پاکستان حکیم محمد سعید
بانی سرپرست

مسعود احمد برکاتی مرحوم
مدیر اوّل

Message of the month

قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ پر مبنی صفحات کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔

قیمت خاص نمبر ۸۰ رُپے
قیمت عام شمارہ ۵۰ رُپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۸۰۰ رُپے
سالانہ (عام ڈاک سے) ۶۰۰ رُپے
سالانہ (دفتر سے دستی لینے پر) ۵۰۰ رُپے
سالانہ (غیر ممالک سے) ۷۰ امریکی ڈالر

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف بینک
ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابلِ قبول ہوگی۔ VPP بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

اس شمارے میں

کیا اور کہاں ؟

مارچ ۲۰۲۰ء

حمدِ باری تعالیٰ	ارسلان اللہ خان	۵
جاگو جگاؤ	حکیم محمد سعید	۶
پہلی بات	سلیم مغل	۷
دو پیڑ تھے بے چارے (نظم)	احمد حاطب صدیقی	۸
حضرت عمر فاروقؓ	عائشہ کشف	۱۰
عظیم قائد	این۔اے۔حسین	۱۳
نگینہ	حکایت سعدیؒ	۱۵
مرزا شکاری	خلیل جبار	۱۷
علم دریچے	نکتہ داں نونہال	۲۳
پانچواں مجرم	بیگم سلمیٰ محمد عقیل شاہ	۲۷
شین شرارت	ننھے مزاح نگار	۳۳
ثریا کی گڑیا (نظم)	صوفی تبسم	۳۸
بجشی میاں	عشرت جہاں	۴۱
نونہال مصوّر	ننھے فن کار	۴۴

17 مرزا شکاری

27 پانچواں مجرم

41 بجشی میاں

سفرنامۂ امریکا	سلیم مغل	۴۷
بلاعنوان انعامی کہانی	پروفیسر عفت گل اعزاز	۵۳
نوبل پرائز	ڈاکٹر سیدّہ صدف اکبر	۶۶
کوالا	سیدہ نازاں جبیں	۶۸
قدیم جاپانی فنون	عروج سعد	۷۳
۲۳/مارچ (نظم)	شمس القمر عاکف	۷۷
نونہال خیرنامہ	سلیم فرخی	۷۸
وفادار سادھو	محمد ذوالقرنین خان	۸۰
معلومات افزا-۲۹۱	سلیم فرخی	۸۶
جوابات معلومات افزا	ادارہ	۸۹
نام بوجھیے	س۔ف	۹۱
عجیب وغریب جزیرہ	محمد احمد آصف	۹۶
نونہال ادیب	لکھنے والے نونہال	۱۰۲
آدھی ملاقات	نونہال قارئین	۱۱۳
انعامات بلاعنوان کہانی	ادارہ	۱۱۸
نونہال لغت	ادارہ	۱۲۰

آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کا امتحان

یہ تصویر ایک مکمل کہانی ہے۔ اسے بہ غور دیکھیے اور اس منظر سے ایک خوب صورت کہانی اخذ کیجیے۔

حمد

ارسلان اللہ خان

وہ خدائے بزرگ و برتر ہے ذات اس کی سبھی سے بڑھ کر ہے
اُس نے پیدا کیا جہاں سارا یہ زمیں اور آسماں سارا
وہ ہے دائم، ہر ایک فانی ہے ہر شے اُس پر ہی لوٹ جانی ہے
چشمِ ظاہر سے گو نہاں ہے وہ پھر بھی ہر چیز میں عیاں ہے وہ
ذات اُس کی ہر ایک سے عالی وہ ہے دنیا جہان کا والی
اُس سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی بھی اُس سے بہتر نہیں ہے کوئی بھی
اُس کی رحمت ، غضب پہ حاوی ہے ہر عطا ارضی و سماوی ہے
چاہے خشکی ہے یا کہ پانی ہے ہر جگہ اُس کی حکمرانی ہے
مشکلوں سے نکالتا ہے وہ ساری دنیا کو پالتا ہے وہ
عظمتیں لاجواب ہیں اس کی نعمتیں بے حساب ہیں اس کی
وہ ہے خالق سب اس کی خلقت ہے اس کو مخلوق سے محبت ہے
چاند ، سورج ، زمین ، سیارے میرے رب نے بنائے ہیں سارے
وہ ہی دیتا ہے آدمی کو غذا ہے اسی کی عطا ، دوا کے شفاء
ہیں اسی کے پہاڑ ، بحروبر وہ ہی کرتا ہے دُور ہر اک شر
ہوں ملائک کہ جن ہوں یا انسان سب پہ کرتا ہے رحمتیں رحمٰن

ارسلان ہم اُسی کو جانتے ہیں
ہر گھڑی بس اسی سے مانگتے ہیں

جاگو جگاؤ

نونہال دوست، شہید حکیم محمد سعید کی یاد رکھی جانے والی باتیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بھائیوں کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہوں یا مظلوم۔''
آپؐ کے ساتھیوں (صحابۂ کرامؓ) نے عرض کیا: ''مظلوموں کی حمایت کی بات تو سمجھ میں آ گئی، لیکن ظالم کی حمایت کی بات .....'' جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
''ظالموں کی مدد یہ ہے کہ انھیں ظلم سے روکا جائے۔''

نونہالو! غور کرو کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند الفاظ میں کتنی بڑی بات سمجھا دی۔ یہ اتنی بڑی اور پیاری بات ہے کہ اگر ہم اس کو دل سے سمجھ لیں اور اس پر عمل کریں تو دنیا جنت بن جائے اور ہمارا پاکستان محبت کے ایک باغ کی طرح ہو جائے' جس میں امن، سکون اور خوشی کے سوا کچھ نہ ہو۔ افسوس ہے کہ ہم حضورؐ کی اس ہدایت پر ذرا بھی عمل نہیں کرتے۔ مظلوم کی مدد نہیں کرتے۔ ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ مظلوم صرف اسی کو نہیں کہتے جس کو مارا پیٹا جائے، بلکہ مظلوم وہ بھی ہے جس کا حق اسے نہ ملے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کسی کام کا اہل ہو اور وہ کام اس کو نہ دیا جائے، بلکہ کسی نااہل کو دے دیا جائے تو وہ بھی مظلوم ہوا۔

جو لوگ کسی کا حق مارتے ہیں، کسی کا پیسہ کھا جاتے ہیں، کسی کی جان لے لیتے ہیں، کسی کا مال لے لیتے ہیں، کسی سے قرض لے کر ہونے کے باوجود واپس نہیں کرتے، وہ ظالم ہیں۔ ان کاموں میں ان کی حمایت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ان کو ان کاموں سے روکنا چاہیے۔ ان کو سمجھانا چاہیے۔ اگر وہ نہ مانیں تو ان کو صاف بتا دینا چاہیے کہ تم ہمارے دوست نہیں ہو۔

(ہمدرد نونہال ستمبر ۱۹۹۸ء سے لیا گیا)

پہلی بات

سلیم مغل

چین میں وائرس کیا نمودار ہوا.....لوگوں کے اظہار میں اندیشوں، اندازوں اور گمانوں کے طوفان اُمڈ آئے۔ کوئی اسے عذابِ الٰہی قرار دے رہا ہے، کسی کو یہ وائرس چوہوں اور چمگادڑوں کا شاخسانہ لگ رہا ہے۔ ''ووہان'' کی سڑکیں ویران ہیں، شنگھائی میں سناٹا ہے، لوگ گھروں میں محصور ہوکر رہ گئے ہیں، بہ ظاہر زندگی دشوار ہوگئی ہے۔ تجارتی سطح پر ہونے والے خساروں کا اندازہ بھی اربوں کھربوں کو تجاوز کر چکا ہے۔ اب ہوگا کیا؟ یہ سوال سب کو پریشان کیے دیتا ہے، مگر میں ٹھہرا پَرلے درجے کا ''رجائی'' مجھے تو آگ اور انگاروں میں بھی شبنم کا قطرہ اُمید کے موتی کی صورت نظر آتا ہے۔ سو مجھے ایسا لگتا ہے کہ چین اس وائرس کا نیا اینٹی وائرس بنالے گا اور ایک بار پھر مستحکم اور منظّم قوت کے طور پر اُبھرے گا اور ہمیں حیران کردے گا۔ اس وقت بھی چین سے جو خبریں آرہی ہیں وہ حیران کردینے کے لیے کافی ہیں۔ چین کے لوگ خوف سے نہیں، احتیاط کے تقاضوں کی وجہ سے خود اپنے گھر میں قید ہیں۔ چین کے سائنس دان اور لیبارٹریز روز و شب متحرک ہیں اور اینٹی وائرس کی تیاری کی سمت کامیابی سے پیش رفت ہورہی ہے۔ چین کے ہزاروں ڈاکٹرز اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی خدمات متاثرہ علاقوں کے لیے پیش کررہے ہیں اور وہ اس کام میں ایک دوسرے پہ سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ جو ڈاکٹرز اس وقت چہروں پہ ماسک چڑھائے ہوئے متاثرہ علاقوں میں کام کررہے ہیں، وہ 36 گھنٹے کام کرتے ہیں اور 8 گھنٹے سوتے ہیں۔ سو کر اُٹھتے ہیں اور پھر 36 گھنٹے کی ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ چینیوں نے 10 روز میں وائرس زدہ مریضوں کے لیے غیر معمولی ہسپتال بنایا اور بنا کر چلا بھی دیا۔ چین نے گزشتہ چند دہائیوں میں انسان کی صورت میں جنات تیار کیے ہیں، جو کام کرتے ہیں صرف کام اور چین کو دنیا کی سب سے بڑی قوت دیکھنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ چین پر عذاب نہیں آئے گا، عذاب تو نالائقوں، نااہلوں، بددیانتوں اور بے ایمانوں پر آتا ہے۔ سو عذاب سہنے کی تیاری تو ہمیں کرنی چاہیے۔

میں اپنے نونہالوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا، مگر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تنقید اور شکووں کی جگہ خود احتسابی کی راہ اپنائیں۔ دوسروں کے اندیشوں میں دُبلے ہونے کے بجائے خود اپنی ذات کو لگن، محنت اور علم و ہنر سے سنواریں۔ یہ جو قائداعظم نے کہا تھا کہ ''کام کام اور کام۔'' یہ جملہ شاید ہم ٹھیک سے نہیں سمجھ پائے، اسے چینی سمجھ گئے۔ اقبال نے کہا تھا: ''گراں خواب چینی سنبھلنے لگے.....گراں خواب چینی نہ صرف سنبھلنے لگے بلکہ واقعی سنبھل گئے۔'' دیکھیے گا اس بار وہ پھر سنبھل جائیں گے.....سچ یہ ہے کہ سنبھلنے کی باری تو اس بار ہماری ہے۔

دو پیڑ تھے بچارے

احمد حاطب صدیقی

بستی میں اک کنارے — دو پیڑ تھے بچارے
کہتے تھے اپنا دکھڑا — کس کو سنائیں پیارے
انساں نے ہم سے بدلے — کس بات کے اُتارے
ہم تو انہیں دکھائیں — دلکش، حسیں نظارے
خود پاس کچھ نہ رکھیں — پھل ان کو دے دیں سارے
ان کے مویشیوں کو — دیں ہم ہی سبز چارے

بارش ہو ہم جو چھوڑیں کچھ بھاپ کے غبارے
ہو دھوپ چلچلاتی تب ہم بنیں سہارے
گرمی میں ہم چلائیں ٹھنڈی ہوا کے دھارے
گندی ہوا کو چھانیں شاخوں کو ہم پسارے
لیکن صلہ یہ پایا ان خدمتوں کا پیارے
مارے کوئی کلہاڑی کوئی چلائے آرے
بچوں کا غول آیا جب بھی تلے ہمارے
شاخیں کسی نے توڑیں پتھر کسی نے مارے
چاقو سے نام کھودا چھلکے بھی چھیل اُتارے
ہم تو یہاں پہ اُگ کے مارے گئے ہیں، مارے
جنگل میں ہم جو اُگتے ہوتے مزے ہمارے
دن، شہری زندگی کے کس دُکھ سے ہیں گزارے

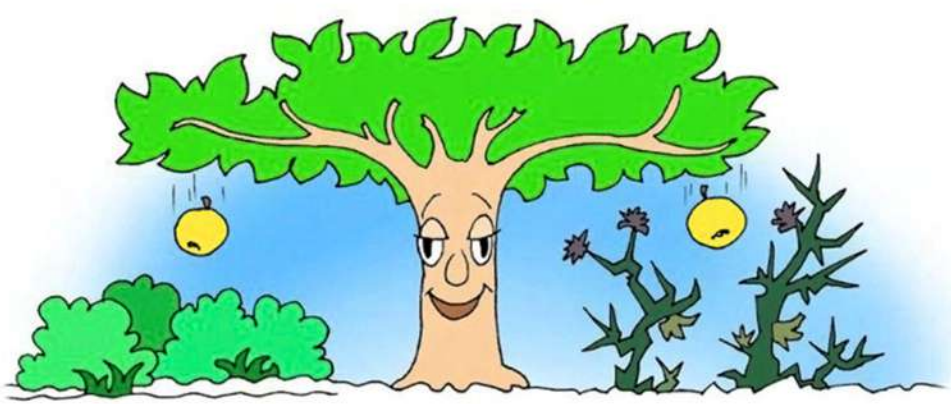

حضرت عمر فاروقؓ

عائشہ کشف

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وصال کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ ان کا دورِ خلافت اسلامی فتوحات کا سنہری دور تھا۔ ان کے دور میں شام، مصر، عراق اور ایران کے کئی علاقے فتح ہوئے۔ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں اسلامی حکومت کی حدود کو وسیع کیا۔

حضرت سیدنا عمر فاروقؓ نے ایسا نظام ترتیب دیا جو آج تک پوری دنیا میں رائج ہے۔ انھوں نے سن ہجری کا آغاز کیا، جیل کا تصور دیا، مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں، مسجدوں میں روشنی کا بندوبست کیا، پولیس کا محکمہ بنایا۔ دنیا میں پہلی بار دودھ پیتے بچوں، معذوروں، بیواؤں اور بے آسراؤں کے وظیفے مقرر کیے۔ فوجی چھاؤنیاں بنوائیں اور فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا اور بے انصافی کرنے والے ججوں کو سزا دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور دنیا میں پہلی بار بااختیار لوگوں کا احتساب بھی شروع کیا۔

حضرت عمرؓ فرماتے تھے: ''جو حکمران عدل کرتے ہیں، وہ راتوں کو بے خوف سوتے ہیں۔''

ان کا فرمان تھا کہ قوم کا سردار قوم کا سچا خادم ہوتا ہے۔

ان کے دسترخوان پر کبھی دو سالن نہیں رکھے گئے۔

وہ زمین پر سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سو جاتے تھے۔
ان کے کُرتے پر ۱۴ پیوند تھے اور ان پیوندوں میں ایک سرخ چمڑے کا پیوند بھی تھا۔
وہ موٹا اور کھردرا کپڑا پہنتے تھے۔ انھیں نرم اور باریک کپڑے پسند نہیں تھے۔
آپؓ جب کسی کو گورنر بناتے تھے تو اسے نصیحت فرماتے: ''کبھی ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہونا، باریک لباس نہ پہننا، چھنا ہوا آٹا نہ کھانا، دربان نہ رکھنا اور کسی فریادی کے آنے پر دروازہ بند نہ کرنا۔''
حضرت عمرؓ کا یہ فقرہ آج بھی انسانی حقوق کے چارٹر کی حیثیت رکھتا ہے: ''مائیں بچوں کو آزاد پیدا کرتی ہیں، تم نے کب سے انھیں غلام بنا لیا۔''
وہ اسلامی دنیا کے پہلے خلیفہ تھے، جنھیں امیر المومنین کا خطاب دیا گیا اور دنیا کے واحد حکمران تھے جو فرمایا کرتے تھے: ''میرے دور میں اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی سزا مجھ کو بھگتنا ہوگی۔''
حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور میں جس جس خطے میں اسلام کا جھنڈا لہرایا، وہاں سے آج بھی ''اللہ اکبر'' کی صدائیں آتی ہیں، وہاں آج بھی لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔
ان کا بنایا ہوا نظام دنیا کے ۲۴۵ ممالک میں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ آج بھی جب کسی ڈاک خانے سے کوئی خط نکلتا ہے، پولیس کا کوئی سپاہی وردی پہنتا ہے، کوئی فوجی جوان ۴ ماہ بعد چھٹی پر جاتا ہے یا پھر حکومت کسی بچے، معذور، بیوہ یا بے آسرا شخص کو وظیفہ دیتی ہے تو وہ غیر ارادی طور پر حضرت عمرؓ کو عظیم ترین حکمران تسلیم کرتی ہے۔
حضرت عمرؓ کے بارے میں مشرکین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اسلام میں اگر ایک عمر اور ہوتا تو آج دنیا بھر میں صرف دینِ اسلام ہی نافذ ہوتا۔

Press ad

Page 12

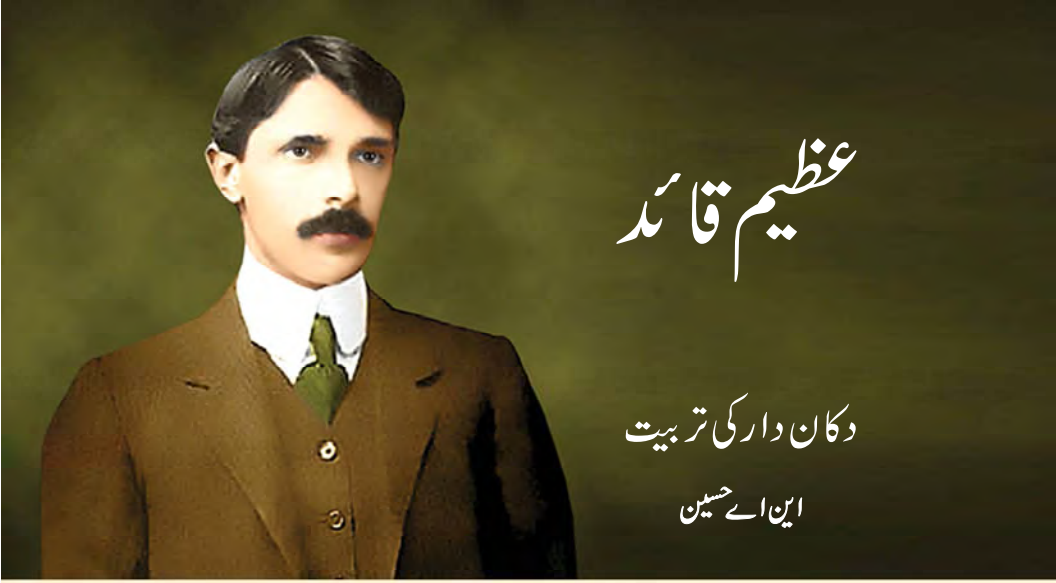

عظیم قائد

دکان دار کی تربیت

این اے حسین

جناب این ۔اے حسین بریگیڈیر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ۲۹/جون ۱۹۴۸ء کو قائداعظم کے اے ڈی سی مقرر ہوئے اور ان کے آخری وقت تک اسی عہدے پر برقرار رہے۔قائداعظم کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:''قائداعظم کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے آپ کو پتا چلے گا کہ وہ قومی معاملات میں بے حد مصروف رہنے کے باوجود زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کی ہر بات میں قوم کے لیے تربیت اور درس کا پہلو ہوتا۔

ایک روز انھوں نے مجھے جرابیں خرید لانے کو کہا۔ میں جناح روڈ پر ایک بڑی دکان حاجی اینڈ سنز سے ساڑھے سات روپے میں جرابیں خرید کر لایا۔ان کا رنگ گرے تھا۔ان پر لیبل بھی لگا ہوا تھا۔جرابیں لاکر میں نے ان کے پٹھان ملازم کو دے دیں۔قائداعظم کی عادت تھی کہ نیا کپڑا استعمال کرنے سے پہلے دھلوا لیتے۔

وہاں ڈیوٹی کا حساب اس طرح تھا کہ ایک دن مظہر کی ڈیوٹی قائداعظم کے ساتھ ہوتی اور میری محترمہ جناح کے ساتھ ہوتی۔دوسرے دن میں قائداعظم کے ساتھ ہوتا اور مظہر محترمہ کے ساتھ

ہوتے۔ جرابیں خریدنے کے اگلے روز میری ڈیوٹی محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ تھی، لیکن قائداعظم نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا تو وہ پلنگ پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ پاس کرسی پر محترمہ فاطمہ جناح تشریف فرما تھیں۔ میں آداب بجالایا۔ وہ حسبِ معمول مسکرائے اور سر کی جنبش سے مجھے خوش آمدید کہا۔

''یہ جرابیں آپ نے خریدی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''دکان دار نے آپ سے نئی جرابوں کے پیسے وصول کیے؟''

''جی ہاں، قائداعظم! اس نے مجھ سے ساڑھے سات روپے وصول کیے۔''

''لیکن یہ جرابیں تو پرانی ہیں۔ اس لیے آپ یہ دکان دار کو واپس کر دیں اور اسے بتائیں کہ اس نے نئی جرابوں کے پیسے وصول کر کے آپ کو پرانی جرابیں دی ہیں۔''

میں دکان دار کے پاس گیا تو مالک جو حاجی صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے بہت پریشان ہوئے کہ ان کی دکان سے ایسی چیز کیوں گئی۔ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ جرابیں قائداعظم کے لیے ہیں، ورنہ وہ پیسے ہی وصول نہ کرتے۔ قائداعظم کبھی مفت چیز نہ لیتے تھے، اس لیے میں نے انھیں بتایا ہی نہیں تھا۔ تاہم انھوں نے نئی جرابیں دے دیں، جو میں نے واپس آ کر ملازم کو دے دیں تو اس نے مجھے بتایا کہ قائداعظم نے جرابیں پہننے سے پہلے انھیں روشنی کے مقابل کر کے دیکھا تو ایک جراب میں سے دھاگا نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ اگلے روز میری ڈیوٹی تھی۔ میں سمجھا کہ قائداعظم کل کا واقعہ بھول گئے ہوں گے، لیکن انھوں نے مجھ سے پوچھا:

''دکان دار نے جرابیں بدل دی تھیں یا آپ نئی خرید کر لائے تھے؟''

''سر! اس نے جرابیں بدل دی تھیں۔''

''میں دکان دار کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔'' قائداعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نگینہ

حکایتِ سعدیؒ

حضرت سعدیؒ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی انگوٹھی میں ایک ایسا نگینہ جڑا ہوا تھا جس کی صحیح قیمت کا اندازہ جوہری بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ گویا دریائے نور تھا، جو رات کے اندھیرے کو دن کے اُجالے میں بدل دیتا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ایک سال سخت قحط پڑ گیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ حضرت کو ان حالات کا علم ہوا تو لوگوں کی امداد کے لیے اپنی انگوٹھی کا وہ نگینہ فروخت کر دیا اور جو قیمت ملی اس سے اناج خرید کر تقسیم کروا دیا۔ جب اس بات کا علم آپؒ کے خیر خواہوں کو ہوا تو ان میں سے ایک نے آپؒ سے کہا: ''یہ آپؒ نے کیا کیا؟ ایسا بیش بہا نگینہ بیچ ڈالا؟''

حضرتؒ نے یہ بات سن کر فرمایا: ''نگینہ مجھے بھی بہت پسند تھا، لیکن میں یہ بات گوارا نہ کر سکتا تھا کہ لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں اور میں قیمتی انگوٹھی پہنے بیٹھا رہوں۔ کسی بھی حکمران کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو تکلیف میں مبتلا دیکھے اور آرام اور زیب و زینت کے سامان کو عزیز رکھے۔''

یہ فرماتے ہوئے آپؒ کے رخسار پر آنسو بہہ رہے تھے۔

جنھیں حق نے بخشا دلِ درد مند — انھیں اپنا آرام کب ہے پسند
اگر حکمراں سوئے آرام سے — رعایا ہو دوچار آلام سے
اگر حکمراں ہوگا شبِ زندہ دار — ملے گا رعایا کو صبر و قرار

Press ad

Page 16

مرزا شکاری

خلیل جبار

جنگل میں ایک بہت اونچے درخت پر مچان بنالی گئی تھی، تاکہ جانور اُچھل کر مچان پر نہ آ سکے۔ مرزا واحد بیگ بہت جوش میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی رائفل کو دیکھ رہے تھے۔ انھیں بچپن میں شکاریات پر مبنی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس بنا پر انھیں شکار سے دل چسپی ہوگئی تھی۔ مرزا صاحب ان دنوں پڑوسی ملک میں ایک ماہ کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ یہاں پر جس شہر اور گاؤں میں ان کے عزیز و رشتے دار موجود تھے، ان سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ وہ جس گاؤں میں قیام کیے ہوئے تھے وہاں ایک جنگلی آدم خور شیر نے گاؤں والوں کو بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ جب انھیں یہ پتا چلا کہ ان کے ایک عزیز ملا حبیبی اس اس

شیر کو ہلاک کریں گے مرزا بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چل دیے۔ ملا صاحب نے بہت سمجھایا کہ تم گھر پر ہی رہو میں شیر کے ہلاک کیے جانے پر تمھیں بلا لوں گا، مگر وہ نہ مانے۔ مجبوراً انھیں انکل بدحواس کو اپنے ساتھ شکار پر لے جانا پڑا۔

ملا جیبی ایک تجربہ کار اور ماہر شکاری تھے۔ انھوں نے مچان ایسی جگہ بنایا جہاں آدم خور شیر کو دیکھا جا سکتا تھا۔ پتوں پر کسی جانور کے چلنے کی آواز پر ملا جیبی نے اپنے منھ پر اُنگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سب خاموشی سے آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ ایک شیر درخت سے بندھی بکری کے پاس آیا۔ ملا جیبی نے رائفل سے شیر کا نشانہ لیا اور فائر کھول دیا۔ گولی شیر کے دماغ میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مرزا صاحب نے زندگی میں پہلی بار شیر کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ حیران رہ گئے کہ کتنی آسانی سے ملا جیبی نے شیر کو ہلاک کر دیا۔ سب لوگ مچان سے اُتر کر شیر کو دیکھ رہے تھے۔ مرزا جی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ شیر کو پاس جا کر دیکھ لیں۔ جب سب شیر کو دیکھ چکے تو ان کو سبکی محسوس ہوئی اور وہ بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی مچان سے نیچے اُترے اور ڈرتے ڈرتے شیر کے پاس گئے۔ وہ حیرت سے شیر کو دیکھنے لگے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اتنے قریب سے شیر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ مر چکا تھا، مگر تھا تو شیر ہی نا۔ مرزا اس وقت مرے ہوئے شیر سے بھی خوف زدہ تھے، لیکن ملا جیبی کے گھر پہنچنے پر ان کا ''خوف'' ختم ہو چکا تھا اور اپنے چہرے سے خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

مرزا جی جب ضلع نینی تال کے ایک گاؤں رام نگر پہنچے وہاں انھوں نے اپنے عزیزوں میں شکاریات سے متعلق من گھڑت قصے سنا دیے۔ لوگ ان کو حیرت سے دیکھنے لگے کہ وہ اتنے بہادر شکاری ہیں کہ ڈھیروں آدم خور شیروں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کی خوب تعریفیں ہونے لگیں اور مرزا کا سینہ احساسِ برتری سے پھول سا گیا۔

مرزا نے شکاریات کے موضوعات پر بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ انھیں شکار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

کہانیوں میں انھوں نے یہی پڑھا تھا کہ شکاری مچان بنا کر بیٹھ گیا، ایک درخت سے جنگلی بھینسا، بکری یا گائے باندھ دی۔ آدم خور شیر جیسے ہی اس بندھے ہوئے جانور کے پاس آیا، شکاری نے رائفل سے فائر کھول دیا۔ شیر کے مرجانے پر وہ ہیرو بن گیا۔ مرزا صاحب، ملاحبیبی کے ساتھ شکار پر کیا گئے، خود کو شکاری سمجھ بیٹھے۔ وہ شکار کرنے کے منصوبے بنانے لگے تھے۔ وہ نامور شکاریوں میں اپنا نام شامل کرانا چاہتے تھے۔

مرزا کو اکثر ایسے خواب نظر آنے لگے تھے۔ جس میں وہ خود کو افریقا کہ جنگلات میں پاتے، جہاں وہ خطرناک درندوں کو منٹوں میں ہلاک کر دیتے تھے۔ شکار کرنے پر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، مگر آنکھ کھلنے پر ان کی خوشی خاک میں مل جاتی۔ وہ خود کو افریقا کے جنگلات میں مچان کے بجائے گھر کی چارپائی پر پڑا ہوا پاتے تھے۔ وہ اپنے مستقبل سے پُر اُمید تھے کہ زندگی میں انھیں شکار کرنے کا موقع ضرور ملے گا اور لوگ ان کی بہادری پر واہ واکریں گے۔

اس گاؤں میں مرزا کے سسرالی رشتے دار رہتے تھے۔ وہاں کے رشتے داروں میں بہادری دکھانے کا مطلب تھا کہ ان کی بہادری کے قصے پاکستان بھر میں پہنچ جاتے اور ان کی سسرال میں عزت بن جاتی۔ اس علاقے میں ایک آدم خور شیر نے گاؤں میں خوب دھوم مچا رکھی تھی۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو وہ ہلاک کر چکا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے مرزا کے فرضی قصے سن کر انھیں آدم خور شیر کا شکار کرنے پر راضی کر لیا۔ وہ راضی تو پہلے ہی تھے بس اپنی خوشامد کرانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی اس عزت افزائی پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس طرح ان کے شکار کرنے کی خواہش پوری ہو جاتی۔ شیر کا شکار کرنا وہ ملاحبیبی سے سیکھ چکے تھے۔ اس لیے انھیں اب کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ مرزا نے سب سے پہلے ان مقامات کو دیکھا جہاں وہ آدم خور شیر دیکھا گیا تھا۔ ان مقامات کو اچھی طرح دیکھ لینے پر ایک جگہ منتخب کر کے مچان بنالی گئی۔ وہاں سے شیر کو آتا آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

رات ہونے سے پہلے پہلے ایک بکری کو مچان سے کچھ فاصلے پر باندھ دیا گیا تھا۔ مرزا نے اپنے

ساتھ گاؤں کے چند لوگوں کو بھی اپنے پاس بٹھالیا تھا، تا کہ گاؤں کے لوگ اس کے کارنامے کو بڑھ چڑھ کر بیان کریں۔ زیادہ لوگوں کے مچان پر بیٹھنے سے جگہ تنگ ہوگئی تھی، مگر مرزا کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ان کے ذہن میں یہی بات تھی کہ شیر بکری کو کھانے ضرور آئے گا اور وہ اس پر فائر کھول دیں گے۔ رات خاصی گزر جانے پر درختوں کے پتوں پر چلنے کی آواز آنے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ شیر یا کوئی اور جانور آرہا ہے۔ آواز آہستہ آہستہ ان کے قریب ہوتی جارہی تھی اور پھر مچان کے نزدیک آواز محسوس ہوئی اور خاموشی چھا گئی۔ کوئی جانور وہاں دکھائی نہ دے سکا۔ سب حیران تھے کہ آواز آنے کے باوجود جانور کیوں دکھائی نہیں دیا۔

''کہیں یہاں آسیب کا سایہ نہ ہو۔'' ایک شخص بولا۔

''مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔'' دوسرا شخص بولا۔

''کیا یہاں آسیب بھی ہوتا ہے۔'' مرزا نے خوف زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ارے صاحب! جنگلوں میں آسیب نہیں ہوگا تو کیا انسان ہوں گے۔'' تیسرا آدمی بولا۔ جنگل میں ایسے ایسے خطرناک آسیب ہوتے ہیں کہ انسانوں کو کہیں سے کہیں اُٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔'' پہلے آدمی نے سنسنی پھیلائی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ اس مچان کے اردگرد بھی آسیب ہو؟'' مرزا نے پوچھا۔

''بالکل یہاں آسیب ہے۔ دیکھا نہیں جانور کے پتوں پر چلنے کی آوازیں آرہی ہیں اور جانور دکھائی نہیں دے رہا ہے۔'' دوسرا آدمی بولا۔

آسیب کا سن کر مرزا بُری طرح خوف زدہ ہوگئے تھے اور ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً مچان سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائیں اور وہ ایسا کر بھی لیتے، مگر وہ یہ سوچ کر خاموشی سے مچان پر بیٹھے رہے کہ مچان سے کود کر بھاگنے میں ان کا سامنا آدم خور شیر سے ہوسکتا ہے۔ آسیب سے وہ بچ سکتے ہیں، مگر آدم خور شیر انھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر دوبارہ پتوں پر کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ آواز پر وہ چونکے۔ تھوڑی دیر تک پتوں پر جانور کے چلنے کی آواز آتی رہی اور ایک شیرنی جھاڑیوں کے پاس سے برآمد ہوئی۔

''یہ تو شیرنی ہے۔'' ایک بولا۔

''خاموش! کوئی بھی ہو، اب اس کی بچنا مشکل ہے۔'' مرزا نے منہ پر اُنگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

مرزا پر آسیب کا خوف پہلے ہی تھا، اب شیرنی کو دیکھ کر ان کے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیرنی کا نشانہ لگانے کو جب انھوں نے رائفل سنبھالی تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے شیرنی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ ان کا نشانہ خطا گیا اور شیرنی بھاگ گئی۔ مرزا ابھی شیرنی پر فائر کر کے سنبھلے بھی نہ تھے کہ مچان کی لکڑیاں ان سب کا وزن برداشت نہ کر پائیں اور کئی لکڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سب سے پہلے مرزا نیچے گرے۔ رائفل ان کے ہاتھ سے کہیں گر پڑی۔ مرزا کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ سخت زمین پر گرنے کی بجائے کسی نرم اور ملائم چیز پر گرے تھے۔ اچانک اس چیز نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مرزا صاحب بھی گھبرا گئے کہ یہ کیا چیز ہے۔ دراصل مچان کے نیچے چاند کی روشنی پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ چیز چاند کی روشنی میں آئی۔ انکل بدحواس کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ جس شے پر وہ سوار تھے وہ آدم خور شیر تھا۔

پہلی دفعہ درختوں کے پتوں پر دراصل شیر کے چلنے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ وہ پیچھے کی جانب سے آیا تھا اور مچان پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی نظر سامنے تھی اس لیے اُسے وہ دیکھ نہ پائے۔

شیر کا پیٹ بھرا ہوا تھا، اس لیے شیر بکری پر حملہ کرنے کی بجائے مچان کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ فائر کی آواز اور اس پر انکل بدحواس کے گرنے پر شیر نے گھبرا کر دوڑ لگا دی۔ شیر خوف زدہ تھا کہ اس پر کیا بلا آ کر گر پڑی ہے۔ وہ تیز تیز دوڑتا ہوا دریا کے کنارے اپنی کچھار میں پہنچ جانا چاہتا

تھا۔ مرزا بھی شیر کو دیکھ کر بُری طرح خوف زدہ تھے۔ انھوں نے شیر کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، کیوں کہ ان کے بال چھوڑ دینے پر خطرہ تھا۔ شیر ان کو گرا کر ہلاک کرسکتا تھا۔ موت کے تصور سے وہ گھبرا گئے تھے اور وہ اس دن کو کوس رہے تھے کہ جب انھوں نے شکاری بننے کا سوچا تھا۔ شکاری بننے کے خبط نے ان کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں آیندہ شکار نہ کرنے کا عزم کرنے لگے تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اب اگر زندگی بچ گئی تو وہ پھر کبھی کسی چوزے کا بھی شکار نہ کریں گے۔

اب سامنے دریا نظر آنے لگا تھا۔ اچانک چاروں طرف سے گاؤں کے لوگ ڈنڈے لے کر نکل آئے تھے۔ یہ گاؤں کے وہ لوگ تھے جو جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شیر شکار ہونے سے بچ گیا تو زخمی ہوجانے پر دریا کا رُخ کرے گا پھر وہ شیر کو گھیر کر ہلاک کر دیں گے۔ ان لوگوں نے جو مرزا کو شیر پر سوار دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ وہ اتنے بہادر ہیں جو شیر کو زندہ قابو میں کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو دیکھ کر مرزا کی ہمت بندھی اور اسی دوران شیر کے جسم کے بالوں پر سے ان کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ یہ اتفاق تھا کہ جہاں وہ گرے نرم نرم گھاس تھی۔ شیر نے خود کو ان لوگوں کے گھیرے سے نکلنے کی بہت کوشش کی، مگر اسے کام یابی نہ ہوسکی۔ گاؤں کے لوگ سخت غصے میں تھے۔ اس شیر نے گاؤں کے کئی لوگوں کو اپنا شکار بنایا تھا۔

شیر کے فرار کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ گاؤں والوں نے ڈنڈوں اور کلہاڑیوں کے وار سے شیر کو ہلاک کر دیا۔ شیر کے ہلاک ہونے پر گاؤں کے لوگوں نے مرزا کو اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔

گاؤں میں ان کی بہادری کی دھوم مچ گئی تھی اور مرزا اپنے دل میں جان بچ جانے پر خوش تھے۔ ان کی بیگم کو بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنے بہادر کب سے ہوگئے۔ اس بہادری کا راز صرف مرزا ہی کو معلوم تھا۔

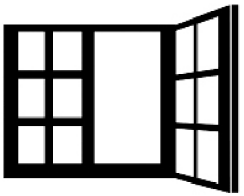

عِلم دریچے

مسلسل اور اچھا مطالعہ حصول علم کا بہترین ذریعہ ہے۔ مطالعہ کرتے ہوئے کوئی اچھی بات، کوئی اچھا قول، فکر انگیز مکالمہ، کوئی خوب صورت خیال نظر سے گزرے تو اسے اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی محفوظ کر لیجئے۔ آپ جانتے ہیں ناں کہ علم کی تقسیم ہی علم کو ضرب دینے کے مترادف ہے۔ اپنی تحریر حوالہ کے ساتھ بھیجئے تاکہ اسے مستند سمجھا جائے۔

والدین کا ادب واحترام

محمد علیم نظامی، لاہور

☆ والدین کے بغیر انسان کی زندگی ادھوری ہے۔

☆ والدین کا ادب واحترام دل و جان سے کرنا چاہیے، کیوں کہ انھوں نے بڑی محنت اور محبت سے تمھاری پرورش کی ہے۔

☆ والدین کے بغیر گھر ویران سا لگتا ہے۔

☆ والدین کی ڈانٹ ڈپٹ بچوں کی فلاح کے لیے ہی ہوتی ہے۔

☆ والدین کی تیمارداری کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔

☆ وہ بچے خوش قسمت ہیں جو اپنے والدین کی زندگی میں ان کو اہمیت دیتے ہیں۔

☆ والدین کا دل دکھانا بڑا گناہ ہے۔

☆ جو بچے والدین کی حکم وعدولی کرتے ہیں، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔

☆ وہ والدین خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی اولاد انھیں پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

☆ جس گھر میں ماں نہیں اس گھر میں رونق و رعنائی نہیں۔

☆ والدین کو خوش کرنے کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

☆ بچوں کی بُری حرکتوں پر والدین ان سے ناراض ضرور ہوتے ہیں، لیکن دشمن نہیں ہوتے۔

☆ والدین جیسی عظیم ہستیوں کا احساس ان کے بچھڑ جانے کے بعد ہوتا ہے۔

حکیم محمد سعید اور وقت

محمد عاقب مصطفیٰ، کراچی

شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید وقت کے پابند تھے اور وہ نونہالوں میں بھی یہ اچھی عادت دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے سب نونہالوں کو چاہیے کہ پابندیٔ وقت کا ہمیشہ خیال رکھیں، کیوں کہ وقت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا۔ امانت میں خیانت ایک بڑا فعل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس شخص نے وقت کو برباد کیا وقت نے بھی اسے تباہ کیا۔ سورج چاند ستاروں کا اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہونا، موسم گرما، موسمِ خزاں، موسمِ بہار، موسمِ سرما، پرندوں کا چہچہانا، فضاؤں میں اُڑنا اور شام کے سائے پھیلتے ہی اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ جانا، سب مظاہرِ قدرت وقت کی پابندی کو ہی تو ظاہر کرتے ہیں، اس لیے اچھا نونہال وہی ہے جو وقت کا پابند ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ

اُمِ ایمان شکیل احمد شیخ منصوری، سانگھڑ

ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی بلندترین چوٹی ہے۔ یہ کوہ ہمالیہ میں نیپال اور تبت کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی بلندی 8850 میٹر (29035) فیٹ ہے۔ سب سے پہلے ایڈمنڈ ہلیری اور شرپا نے ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو اسے سر کیا۔

بکھرے موتی

تسنیم شکیل احمد، سانگھڑ

☆ اپنے زخم اسے مت دکھاؤ جس کے پاس مرہم نہ ہو۔

☆ زندگی میں وہی لوگ کام یاب ہوتے ہیں جو بار بار کوشش کرتے ہیں۔

☆ بڑوں کے آگے نہیں، پیچھے چلو، ورنہ اپنی منزل کھو بیٹھو گے۔

☆ لوگوں کے پاس اپنی ضروریات بہت کم لے جاؤ، اس میں ذلت اور رسوائی ہے۔

☆ کنجوس اللہ کا دشمن ہے، چاہے عبادت گزار ہو۔

☆ محبت دور کے لوگوں کو قریب اور نفرت قریب کے لوگوں کو دور کر دیتی ہے۔

☆ توبہ کے درخت کو شرمندگی کا پانی دینا چاہیے۔

☆ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ترین ایمان ہے۔

☆ علم ایسا بادل ہے جس سے رحمت برستی ہے۔

انٹرنیٹ

شاعر : فراغ روہوی

انتخاب : زُنیر بن اشعر، کراچی

میں ہوں مسٹر انٹر نیٹ
کرلو اپنے گھر میں سیٹ
کمپیوٹر میں رہتا ہوں
سب کو ویلکم کہتا ہوں
جو کچھ دیتا ہے کالج
مجھ میں بھی ہے وہ نالج
جو بھی چاہو لے لو کام
حاضر ہوں میں صبح و شام
ہوتا ہے جو گھنٹوں میں
کردیتا ہوں منٹوں میں
بھارت ہو یا پاکستان
امریکا ہو یا جاپان
گڑیا اور بنٹی کے نام
جب چاہو بھیجو پیغام
چھپتے ہیں جو سرحد پار
مجھ پر پڑھ لو وہ اخبار
دے کر انٹر کا اگزام
مجھ سے پوچھو تم انجام
اسٹوڈنٹ ہو یا ٹیچر
مالک ہو یا منیجر
سب میرے دیوانے ہیں
میرے ہی پروانے ہیں
میرے بارے میں سن کر
حیرت میں ہے جادوگر

مطالعہ

اقراء نصیر احمد، اٹک

﴿ مطالعہ غم اور اُداسی کا بہترین علاج ہے۔
(شیخ سعدی)

﴿ اچھی کتابوں کا مطالعہ انسان کو بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ (امام غزالی)

﴿ مطالعے سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی جاتی رہتی ہے۔ (حکیم لقمان)

سچ سے پرہیز

محمد حبیب، سکھر

افلاطون سچائی کی فضیلت بیان کررہا تھا۔ اس نے کہا: ''سچائی اور سچ کی عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن ایک ایسی سچی بات بھی ہے جس سے انسان کو بچنا چاہیے۔''

ایک شاگرد نے سوال کیا: ''سچی بات سے پرہیز کیا معنی؟''

افلاطون نے کہا: ''ہاں بات سچی ہے، لیکن اس سے بچنا چاہیے۔ وہ بات ہے اپنی تعریف وستائش خود کرنا، چاہے تم میں وہ سب خوبیاں اور اوصاف موجود ہی کیوں نہ ہوں، جن کا تم اظہار کررہے ہو۔''

قرض کا گنا

مہک اکرم، لیاقت آباد

ایک کسان کی گنے کی فصل بہت اچھی ہوئی۔ وہ گنا بیچنے کے لیے ایک تاجر کے پاس پہنچا اور کہا: ''یہ سارا گنا خرید لیں۔ اگر نقد نہ لے سکیں تو اُدھار دینے کو بھی تیار ہوں۔''

تاجر اُصول پسند آدمی تھا اور شاعر بھی تھا۔ کسان کی بات سن کر اس نے کہا: ''بھائی! مجھے تو اس سودے سے معاف رکھو۔ میں گنوں کے بغیر کام چلا لوں گا، لیکن تُو تقاضا کرنے میں صبر نہ کرے گا۔''

پھر یہ شعر کہے:

قرض لینا سہل ہے، لیکن نتیجہ قہر ہے
قرض لے کر آدمی آسودہ رہ نہیں سکتا
مانتا ہوں قرض کے گنے میں بھی ہوگی مٹھاس
تلخیاں ہیں جو تقاضے میں، وہ سہہ سکتا نہیں

میرے الفاظ

رابعہ فاروق، ڈیرہ اسماعیل خان

ہمارے دکھی ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم مطلوبہ نتائج کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بسا لیتے ہیں اور سوچتے ہیں لازماً ایسا ہی ہوگا اور جب ویسا نہیں ہوتا تو ہم اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتے اور ذہنی و جذباتی لحاظ سے منقسم ہو جاتے ہیں، پریشان ہو جاتے ہیں، اس لیے ہمیشہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لے کر نتائج کے بارے میں غور ضرور کر لیں۔ ہمیشہ اچھی اُمید رکھیں، لیکن بُرے نتائج کے لیے بھی خود کو تیار رکھیں۔ اس طرح یا تو آپ جیت جائیں گے یا سیکھ جائیں گے۔

میرا بھیا

نائلہ جبین، ڈیرہ اسماعیل خان

میرا بھیا پیارا پیارا
ابو کا ہے راج دلارا
امی کی آنکھوں کا تارا
سب کو اس سے پیار بہت ہے
وہ بھی تابعدار بہت ہے
ہنس مکھ، نیک طبیعت اس کی
نیکی کرنا عادت اس کی
جان سے پیاری عزت اس کی
ہمدردی و پیار کا پیکر
خوشیوں کے بیوپار کا پیکر

پانچواں مجرم

بیگم سلمیٰ محمد عقیل شاہ

وہ پانچوں سر جھکائے کھڑے تھے۔ انھیں شیطان کے چیلے پکڑ کر شیطان کی عدالت میں لائے تھے۔ پانچوں حیران تھے کہ آخر وہ کس جرم کے تحت یہاں لائے گئے ہیں۔ آخر ایک کالے پردے کے پیچھے سے شیطانی ہنسی کے ساتھ ہی ایک آواز گونجی: ''مجرم نمبر ایک کا جرم بتایا جائے۔''

''استاد! اس نے دن رات ایک کر کے اپنے والدین کی خدمت کی۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ان کے بڑھاپے کا سہارا بنا۔''

ایک شیطانی ہنسی کے ساتھ ہی پھر خاموشی چھا گئی۔

''مجرم نمبر۲ کا جرم کیا ہے؟''

''اس کے دل میں بہت محبت اور ہمدردی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے مرحوم بھائی کے بچوں اور بیوہ بھابھی کی سرپرستی کی۔ ان کے بچوں کو اپنے بچوں سے زیادہ پیار دیا اور اعلا اور بہتر تعلیم دلائی۔ یہاں تک کہ بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ یہی اس شخص کا جرم ہے۔''

ایک بار پھر شیطانی ہنسی بلند ہوئی۔

''مجرم نمبر۳ نے کیا جرم کیا ہے؟''

تیسرا مجرم بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ ''اُستاد! اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے خاندان سے بغاوت کی اور اپنی بہن کو گاؤں سے تعلیم دلانے کے لیے شہر لے آیا اور اپنی بہن کو اعلا تعلیم کے ساتھ بے انتہا محبت دی اور ایک مہذب خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ یہی اس کا جرم ہے۔''

''اور مجرم نمبر۴ کو کس جرم میں پکڑا ہے؟''

''استاد! اس مجرم کے اندر خدمتِ خلق کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جگہ تربیت گاہ قائم کی تھی، جہاں لوگ تربیت پا کر اپنا کاروبار کر سکتے تھے اور اس طرح بے شمار لوگوں کو معاشرے کا اچھا شہری بنانے میں کام یاب ہوا۔ یہی اس کا جرم ہے۔''

''بس بس میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ ایسے مجرموں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارا کام مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

''استاد! پانچواں مجرم باقی ہے۔''

''بس کرو، بس کرو ان مجرموں کے کارنامے مزید نہیں سن سکتا، لے جاؤ سب کو سو سو کوڑے لگا کر اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دو، تاکہ ان کے دماغ سے نیکی کا بھوت اُتر جائے۔''

پانچوں ایک ساتھ بول پڑے: ''نہیں ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہمیں مت مارو، مت مارو۔''

صبور بے چینی کے عالم میں نیند سے بیدار ہوا: ''میرے خدایا! یہ کیسا خواب تھا۔''

وہ بستر سے اُٹھ کر دادا جان کے کمرے کی طرف گیا، لیکن دادا جان تو فجر کی نماز کے بعد تازہ ہوا کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ صبور دادا جان کے کمرے میں ان کے بستر پر لیٹ گیا اور دادا جان کا انتظار کرنے لگا۔

دادا جان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے: ''صبور بچے! آج کیا بات ہے چھٹی ہونے کے باوجود تم اتنی جلدی جاگ گئے ہو، کوئی پریشانی ہے کیا؟''

''دادا جان! آپ پہلے بیٹھیے تو سہی پھر میں بتاتا ہوں۔''

دادا مسہری پر بیٹھ گئے تو اس نے کہا: ''دادا جان! میں نے آج بہت ہی عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

دادا جان نے کہا: ''بیٹا! مجھے کچھ بتاؤ تو، جب ہی میں کچھ جواب دے سکوں گا۔''

پھر صبور نے اپنا خواب دادا جان کو سنایا۔ خواب سننے کے بعد دادا جان ہلکی مسکراہٹ لیے صبور کو غور سے دیکھنے لگے۔

''سچ دادا جان! میں بہت پریشان ہوں۔''

''صبور بچے! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ حالات جتنے بھی مشکل ہو جائیں حق اور سچ کا ساتھ دینا چاہیے۔''

''کیا مطلب دادا جان!''

''شیطان کی نظر میں تو ہر نیک آدمی اس کا دشمن ہے۔ہمیں اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ شیطان کی نظر میں تو میں بھی مجرم ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' صبور نے پوچھا۔

''تم خواب میں پانچ میں سے چار مجرموں کے حالات جان چکے ہو۔میں تمھیں بتانا تو نہیں چاہتا تھا،لیکن خیر! پانچویں مجرم کی کہانی سناتا ہوں۔''

''کیا مطلب دادا جان!''

''سنو! جب پاکستان بنا تو بہت لوگوں نے ہجرت کی۔اس وقت سفر کرنا بہت خطرناک تھا۔دشمن ہمارے خون کا پیاسا تھا۔قتل و غارت گری کے طوفان سے بچ کر کچھ لوگ مہاجر کیمپ تک پہنچ گئے تھے۔ بیشتر خاندان ایسے تھے جن میں کوئی والدین سے محروم ہوگیا تھا،کوئی اپنی اولادوں سے بچھڑ گیا تھا۔مہاجر کیمپ میں چھوٹے چھوٹے دولاوارث بچے بھی تھے۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔میں نے اور تمھاری مرحومہ دادی نے ان دونوں کو سینے سے لگایا اور اپنی اولاد کی طرح پالا۔شروع میں مشکل سے گزارہ ہوا تھا۔میں نے چھوٹا سا کاروبار کیا۔اللہ نے برکت دی۔خوش حالی آ گئی۔ وہ دونوں بچے بڑے ہوگئے تو اچھے گھرانوں میں ان کی شادی کر دی۔''

صبور دادا کی باتیں سننے میں محو تھا۔اچانک پوچھا:''اب وہ دونوں بچے کہاں ہیں؟''

''ایک بچہ تو ڈاکٹر مسرور ہے، جو تمھارے ابو ہیں۔دوسری تمھاری پھوپی ہیں جو ایک گرلز کالج میں پروفیسر ہیں۔'' صبور کا مونہہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''دادا جان! اگر میں یہ خواب نہ دیکھتا تو آج آپ کی عظمت سے بھی واقف نہ ہوتا۔''

دادا جان نے مسکراتے ہوئے کہا:''تم مجھے اپنے خواب کا پانچواں مجرم بھی کہہ سکتے ہو۔''

صبور دیر تک دادا جان کے سینے سے لگ کر بیٹھا رہا، جہاں چاہت اور محبت کی ٹھنڈ تھی اور سکون ہی سکون تھا۔

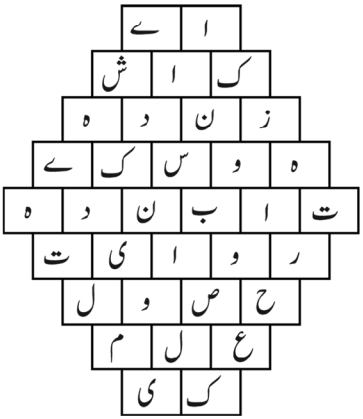

اے کاش زندہ ہو سکے تابندہ روایت حصولِ علم کی

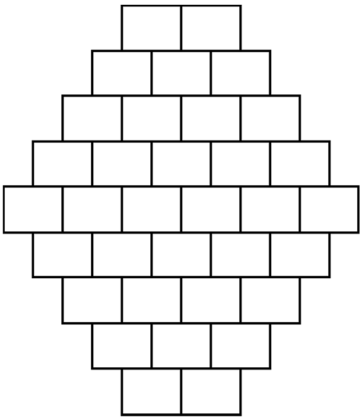

پہلی تصویر کو غور سے دیکھیے۔ ہر قطار میں لکھے گئے حروف ایک لفظ بنا رہے ہیں اور تمام الفاظ مل کر ایک خوبصورت بامعنی جملہ۔ اگر آپ اس سے بہتر جملہ دے سکیں تو ہمارے پاس آپ کی ذہانت کے اعتراف کے علاوہ ایک خوب صورت انعام بھی موجود ہے۔ نیچے دیئے گئے خاکے میں الفاظ پُر کیجیے اور اس کی فوٹو کاپی ہمیں ارسال کر دیجیے۔

اے مرے ہم قلمو

شہید پاکستان حکیم محمد سعید لے ۱۰۰ ویں یوم ولادت پر

ہمدرد نونہال ایوارڈ

کا اعلان کرتے ہوئے ہم نہایت خوشی محسوس کر رہے ہیں

۹ جنوری ۲۰۲۱ کو قائدِ نونہال حکیم محمد سعید

کے جنم دن پر یہ ایوارڈ، ایک پروقار تقریب میں

نونہالوں کے غیر معمولی قلم کاروں کو دیئے جائیں گے

بہترین کہانی | بہترین نظم | بہترین سائنسی تحریر | بہترین تخلیقی کاوش

تو پھر ہو جایئے تیار

Get set, ready and go

تفصیلات آئندہ ماہ

شین شرارت

طنز و مزاح کے اس سلسلے میں لطائف، مزاحیہ واقعات،
مزاحیہ اشعار، دلچسپ کارٹون یا تصاویر بھی بھجوائی جاسکتی ہیں

ایک بس کنڈکٹر کی شادی ہو رہی تھی۔ کنڈکٹر دلہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا کہ سامنے سے اس کے والدین آتے دکھائی دیے۔ اس نے اپنے دلہن سے کہا: ”بیگم! ساتھ ہو کر بیٹھو، دو سواریاں اور آرہی ہیں۔“

محمد عدیل حسنین، جھنگ صدر

استاد: چاند پر پہلا قدم کس نے رکھا تھا؟

شاگرد: نیل آرمسٹرونگ نے

استاد: بالکل صحیح اور دوسرا؟

شاگرد: دوسرا بھی اُسی نے رکھا تھا کوئی لنگڑا تھوڑی تھا وہ

رمشہ جاوید، کراچی

استاد: ”فرحت بخش کو جملے میں استعمال کرو۔“

شاگرد: ”اے اللہ میاں! چچی فرحت کو بخش دے۔“

بشریٰ کریم، نواب شاہ

استاد شاگرد سے: ”پان کی مؤنث بتاؤ۔“

شاگرد: ”پانی“

سیدہ اقراء اعجاز، حیدرآباد

تجربے کے دوران ایک پروفیسر نے پانچ روپے کا سکہ اپنی جیب سے نکال کر کسی تیزاب میں ڈالا اور اپنے ایک شاگرد سے پوچھا: ''بتاؤ یہ گل جائے گا یا نہیں؟''

شاگرد نے جواب دیا: ''بالکل نہیں جناب!''

پروفیسر نے خوش ہو کر کہا: ''یہ تمھیں کیسے پتا چلا؟''

شاگرد نے جواب دیا: ''اگر اس تیزاب میں یہ سکہ گلنا ہوتا تو آپ ہم میں سے کسی سے سکہ مانگتے۔''

مہک اکرم، لیاقت آباد

ایک شخص اپنے دوستوں کو اپنا فلیٹ دکھانے کے لیے لے گیا اور بتایا: ''اس کی سجاوٹ میں نے خود اپنے دماغ سے کی ہے۔''

ایک دوست نے کہا: ''تب ہی کچھ خالی خالی نظر آ رہا ہے۔''

مجیب احمد، اسلام آباد

ایک بہت بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت لینے کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ ڈاکٹر صاحب بغیر وقت دیے ایک مریض کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ مریض بہت خوش ہوا اور کہا: ''آپ نے بڑی عنایت کی جو تشریف لائے، لیکن آپ نے تو ایک ماہ بعد کا وقت دیا تھا۔''

ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے: ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دراصل ہوا یہ کہ تمھارے برابر والے بلاک میں ایک مریض کو دیکھنے آنا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مریض مر چکا تھا، لہٰذا میں نے سوچا، یہاں آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کرتا چلوں۔''

محمد منیر نواز، ناظم آباد

جج نے ملزمہ سے سوال کیا: ''تمھارا کہنا ہے کہ تم نے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔''

''مگر میرا یہ ارادہ نہ تھا۔'' ملزمہ نے صفائی پیش کی۔

جج نے کہا: ''یعنی تمھاری نیت حملہ کرنے کی نہیں تھی؟''

ملزمہ نے جواب دیا: ''نہیں میری نیت کرسی توڑنے کی نہیں تھی۔''

روبینہ ناز، رتن تلاؤ

میری انگریزی کی تو اسی دن دھوم مچ گئی تھی
جب میں نے Got Married
کا ترجمہ شادی شدہ بکری کر دیا تھا

تین دوست بیٹھے ہوئے کھجوریں کھا رہے تھے کہ اتنے میں ان کا ایک مفت خورہ دوست بھی اتفاقاً وہاں پہنچ گیا اور کہنے لگا: ''دوستو! کیا کھا رہے ہو؟''

ایک نے جواب دیا: ''اس مہنگائی کے دور میں زہر کے سوا کیا کھائیں گے۔''

آنے والے دوست نے جھٹ کئی کھجوریں اُٹھا کر منھ میں ڈالیں اور بولا: ''تم لوگوں کے بغیر تو میرا جینا بھی حرام ہے۔''

خرم عزیز، حیدر آباد

ایک بوڑھا لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ کم زوری قدم قدم پر رکاوٹ بن رہی تھی۔ جب وہ بالکل نڈھال ہو گیا تو اس نے لکڑیوں کے گٹھے کو ایک طرف پھینکا اور تکلیف سے چیخا: ''اُف! اس سے تو بہتر ہے، کاش! موت آ جائے۔''

موت فرشتے کی صورت میں سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور بوڑھے سے دریافت کیا: ''بابا! کیسے یاد فرمایا آپ نے مجھے۔''

بوڑھا جلدی سے اپنے گٹھے کی طرف بڑھا اور اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بولا: ''کچھ نہیں، ذرا ہاتھ لگا کر اس گٹھے کو میرے سر پر رکھ دو۔''

گل ناز حمید، لاہور

ایک گدھا کسی گھر کی دیوار سے کان لگا کر کھڑا تھا۔ ایک بکری کا وہاں سے گزر ہوا۔ بکری نے گدھے سے پوچھا: ''بھائی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

گدھا بولا: ''اندر دو آدمی لڑ رہے ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہہ رہے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ دونوں میں سے میرا بچہ کون سا ہے۔''

اسما خان، میرپور خاص

بیٹا: ''ابو! کیا ہم ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اللہ میاں کے پاس جا سکتے ہیں؟''

باپ: ''ہاں، اگر ہوائی جہاز اُڑتے اُڑتے خراب ہو جائے تو۔''

ہانیہ حسین، کراچی

ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا: ''کمال کر دیا تم نے بالکل صحیح وقت پر اشرف صاحب کا آپریشن کر دیا۔ اگر ایک دو دن کی تاخیر ہو جاتی تو وہ خود ہی تن درست ہو جاتے۔''

وحید احمد، راولپنڈی

اکبر نے بیربل سے تین نئے سوال پوچھے اور کہا کہ سب کا جواب ایک ہی ہونا چاہیے:

''دودھ کیوں اُبل جاتا ہے؟ پانی کیوں بہہ جاتا ہے؟ ہانڈی کیوں جل جاتی ہے؟''

بیربل نے جواب دیا: ''بادشاہ سلامت! Whatsapp کی وجہ سے۔''

اکبر اُسی وقت تخت سے اُٹھا اور بیربل کے قدموں میں گر گیا۔

(آمنہ جنت، کراچی)

سفید مرغی ، پُھلا کے سینہ، یہ کالی مرغی سے جا کے بولی
ہے میری جیسی بھی کوئی مُرغی بھلا جہاں میں ، بتا دے مجھ کو
تو کالی بولی کی ہوں میں کالی ، دیے ہیں لیکن سفید انڈے
میں تجھ کو مانوں جو کالا انڈا، بس ایک دے کر دکھا دے مجھ کو

سویرا ہوتے ہی شاعر پہ یہ ستم ٹوٹا
پولیس لے گئی تھانے ، وہاں اسے کوٹا
کہا کہ مال برآمد کرا ابھی فوراً
سنا ہے رات کو تُو نے مشاعرہ لوٹا

شوکت جمال

ثریا کی گڑیا

صوفی تبسم

سنو اِک مزے کی کہانی سنو
کہانی ہماری زبانی سنو

ثریا کی گڑیا تھی چھوٹی بہت
نہ دُبلی بہت اور نہ موٹی بہت

جو دیکھو تو ننھی سی گڑیا تھی وہ
مگر اِک شرارت کی پُڑیا تھی وہ

جو سوتی تو دن رات سوتی تھی وہ
جو روتی تو دن رات روتی تھی وہ

نہ امی کے ساتھ اور نہ بھیا کے ساتھ
وہ ہر وقت رہتی ثریا کے ساتھ

ثریا نے اِک دن یہ اس سے کہا
''میری ننھی گڑیا یہاں بیٹھ جا

بلایا ہے امی نے ، آتی ہوں میں
کھٹولے میں تجھ کو سلاتی ہوں میں

وہ نادان گڑیا خفا ہوگئی
وہ روئی ، وہ چلائی اور سوگئی

اچانک وہاں اِک پری آ گئی
کھلی آنکھ گڑیا کی ، گھبرا گئی

تو بولی پری مسکراتی ہوئی
سنہری پَروں کو ہلاتی ہوئی

''اِدھر آؤ تم مجھ سے باتیں کرو
میں نازک پری ہوں نہ مجھ سے ڈرو''

وہ گڑیا ، مگر اور بھی ڈر گئی
لگی چیخنے ''ہائے میں مرگئی

مری آپا! آکے بچالو مجھے
کسی کوٹھڑی میں چھپالو مجھے''

ثریا نے آکر اُٹھایا اُسے
اُٹھا کر گلے سے لگایا اُسے

گلے سے لگاتے ہی چپ ہوگئی
وہ چپ ہوگئی اور پھر سوگئی

ثریا کو دیکھا ، پری اُڑ گئی
جدھر سے تھی آئی ، اُدھر مڑ گئی

Press ad

Page 40

بخشی میاں

عشرت جہاں

بخشی میاں کا دروازہ اکثر بند رہتا تھا۔ کھڑکی اس وقت کھلتی جب انھیں پھلوں کے چھلکے پھینکنے ہوتے، یا گلی میں کھیلتے بچوں کو ڈانٹنا ہوتا۔

اکثر ان کی تیز آواز سنائی دیتی: ''گھر میں ٹک کر بیٹھا نہیں جاتا۔ اودھم مچا رکھا ہے محلے میں، کھڑکیاں توڑنے کو پیدا ہوئے ہیں، سب بھاگ جاؤ۔ اب گلی میں مجھے کوئی نظر نہ آئے۔''

وہ کھڑکی سے سر نکال کر چلّاتے تو بچے اپنے اپنے گھروں کے دروازوں کے پیچھے سے انھیں جاتا

دیکھ کر ذرا دیر بعد پھر سے اِکٹھا ہو جاتے اور کھیل کود میں مگن ہو کر سب کچھ بھول جاتے۔ دوسروں کے بچوں کو تو کیا انھوں نے کبھی اپنے بچوں کو بھی کھیل کود میں پڑنے نہ دیا تھا۔ اگر کبھی وہ گھر سے باہر نکل بھی آتے اور بخشی میاں کو پتا چل جاتا تو وہیں سے پکڑ لاتے۔ پھر بچوں کے ساتھ ساتھ بیوی کو بھی سنا ڈالتے۔

بخشی میاں محلے کے کسی فرد کو اپنے لائق نہ سمجھتے۔ ان کے خیال میں لوگ اس قابل نہیں کہ انھیں منھ لگایا جائے۔ بیٹے بڑے ہو کر ذرا قابل ہوئے تو ایک ایک کر کے گھر چھوڑ گئے۔ اپنی دنیا بنانے کے لیے انھیں نکلنا ہی پڑا۔ بیٹوں کے جانے کا ذمے دار بھی وہ بیوی کو ہی ٹھہراتے: ''اگر تم ڈھنگ سے ان کی تربیت کرتیں تو وہ جاتے ہی کیوں؟'' وہ اکثر طعنہ دیتے اور بے چاری بیوی خاموشی سے سن لیتی۔

بخشی میاں کے گھر سے باہر جانے کے بعد اللہ سے فریاد کرنے لگی۔ بیٹے بھی یاد آنے لگے۔ اسے گزرے ہوئے وہ دن یاد آ گیا، جب وہ اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی .....

''میری خواہش ہے کہ میں اتنی دولت کماؤں کہ آپ کے لیے ایک محل خرید سکوں!'' بلال نے سر اُٹھا کر ماں سے کہا۔

''اور میری خواہش ہے کہ میں ایک بڑا باغ خریدوں، جس میں قسم قسم کے پھل دار درخت ہوں، پھول ہوں، سبزہ ہو، جھولے اور بہت کچھ۔'' دانیال کی آنکھوں میں بھی خواب سجے تھے۔

''اور میری خواہش ہے کہ میں ایک جہاز خریدوں، جس میں بیٹھ کر اماں کے ساتھ ملکوں ملکوں کی سیر کر سکوں۔'' چھوٹا بھائی نہال بولا۔

''اور میری خواہش ہے، میرے تینوں بیٹے میرے پاس ہی رہیں، میری آنکھوں کا تارا بن کر۔'' ماں محبت سے بولی۔

''ہم سب بلال بھائی کے محل میں رہیں گے، دانیال بھائی کے باغ کی سیر کریں گے اور میرے

جہاز میں گھومیں پھریں گے۔'' نہال چہک کر بولا۔ سب ہنسنے لگے۔

ماں بچوں کی باتیں یاد کر کے روتے روتے ہنس پڑی۔

اُدھر بخشی میاں دوستوں میں بیٹھے اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔

''ارے نانبائی کی اولاد ہے۔ بے شک آج اہم عہدے پر ہے، مگر ہے تو نانبائی۔'' انھوں نے حاکم شہر کے خاص افسر کے بارے میں شوشہ چھوڑا۔

''بخشی بھیا! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' ایک دوست بولا۔

بخشی میاں چہک کر بولے: ''نا بھئی ہم کیا کسی سے ڈرے بیٹھے ہیں۔ اس کے باپ دادا گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے۔ انسان کو اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔''

وہ سوچ سمجھ کر بولنے والوں میں سے نہ تھے۔ نواز خان سے انھیں نہ جانے کیا پرخاش تھی کہ اس کے خلاف بولتے رہتے۔ خیر اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی، مگر وہ جو کہتے ہیں منھ سے نکلی کوٹھوں چڑھی، وہی معاملہ ہوا۔

ایک دن حاکم شہر کے چند کارندے آئے اور بخشی میاں کو لے گئے۔ نواز خان کی تواضع نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ کئی دن مہمان خانے میں رہ کر گھر آئے تو ان کی چلتی زبان رک گئی۔ بیوی کو بھی ان کی بدزبانی سے نجات مل گئی۔ سچ ہے اونٹ پہاڑ کے سامنے آتا ہے تو اسے اپنے قد کا اندازہ ہوتا ہے۔

انھیں اپنی کڑوی زبان کے نقصان کا اندازہ ہوا تو ان کے مزاج میں تبدیلی آ گئی، بلکہ کایا پلٹ گئی۔ بیٹوں کو پتا چلا تو گھر لوٹ آئے۔ ابا کے مشورے سے تینوں بھائیوں نے مل کر ایک جگہ بڑا سا خوب صورت گھر لیا، جس میں ایک خوب صورت سا باغ بھی تھا۔ ماں نے تین خوب صورت اور خوب سیرت شہزادیوں جیسی دلہنیں تلاش کر کے بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔ یوں سب مل جل کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔

نونہال مصوّر

صارم علی، کراچی

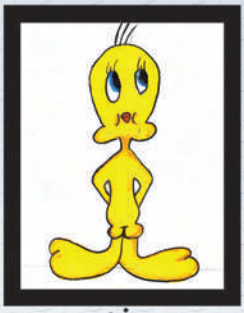

عبدالرافع، کراچی

سید محمد احمد، کراچی

سعد سلیم

زہرہ امجد، ڈیرہ غازی خان

مجاہد، کراچی

نویرا خالد، حیدرآباد

سیدہ فاطمہ شعیب، کراچی

محمد وارث، کراچی

محمد حذیفہ سمیع، کراچی

آمنہ عاقل، پشاور

حُر بن اشعر، کراچی

میمونہ سرور اعوان، لاہور

محمد حسین عارف، جہلم

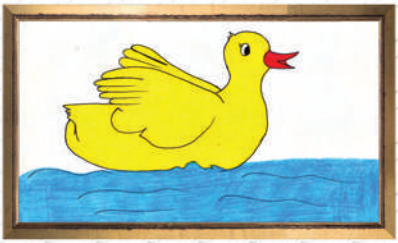

رمشاء معین الدین، کراچی

قراۃ العین، ڈیرہ غازی خان

Press ad

Page 46

سلیم مغل

نئی اُڑان

سان فرانسسکو ائیر پورٹ پہ رمیصا مجھے الوداع کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں نے بھی ضبط کی انتہا کر دی۔ اپنی کیفیت کو رمیصا پر ظاہر نہ ہونے دیا اور اسے پیار کرتا اور دعائیں دیتا ہوا نیو جرسی کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز میں اپنی سیٹ پہ بیٹھنے کی دیر تھی کہ جبر سے روکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور پھر تو جیسے جھڑی سی لگ گئی۔

Lombard Street

Fine Art Place

Cable Cars

بے برج سان فرانسسکو

Golden Gate Bridge

ولیئم کے ریشمی کتے ''ریلے'' کے ساتھ۔ایسا مخلیں کتا آج تک نہیں دیکھا

Alcatraz Island

عبرانی زبان میں توریت پڑھتی ہوئی ہمسائی نے پوچھا ''خیریت تو ہے ناں؟'' میں کیا کہتا...جواباً بس اتنا ہی کہہ پایا ''میری آنکھوں میں کل سے جلن کی کیفیت ہے اور مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ آنکھوں کے ڈراپس بھی بھول کے آ گیا ہوں۔''

میری ہم سفر نے فلائیٹ اسٹاف سے رابطے کا مشورہ دیا مگر میں نے شکریہ ادا کیا اور آنکھیں موند لیں۔راستے میں کچھ گفتگو بھی ہوتی رہی مگر مجھے بالکل اندازہ نہ ہوا کہ یہ خاتون میرے آنسوؤں کی تہہ تک پہنچنا چاہ رہی ہے۔کیسی کایاں عورت تھی اور کیسا تیر بہ ہدف اندازہ لگایا۔ نیو جرسی ائیر پورٹ پر اترتے ہوئے کہنے لگی....

God bless you... Daughters are always loving.

She will come home soon

سان فرانسسکو سے نیو جرسی دراصل بحرالکاہل سے بحراوقیانوس تک کا طویل ترین سفر ہے۔ لگ بھگ 6 گھنٹے کی فلائیٹ تو ہوگی۔ پہلی بار یہ سفر مشکل لگا۔ بیٹی یاد آتی رہی جسے میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔ دوران سفر شرایو بھی یاد آتی رہی جو اتنے دنوں میں رمیصا کی طرح مجھے اپنی بیٹی سی لگنے لگی تھی۔ شرایو خوش رہو۔ بہت سی دعائیں تمھارے اور درشینی کے لیے۔

بعض رشتوں کے بیچ یہ مقناطیسیت کہاں سے آجاتی ہے۔ لگتا ہے اللہ میاں ان رشتوں کو ضرور محبت کی مٹی سے گوندھتے ہوں گے۔ مغرب نے کوئی اور نقصان کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر رشتوں کی اس روح کو ضرور کھو دیا ہے جو ان رشتوں کو باہم جوڑ کر ایک خان دان بنائے رکھتی ہے۔ یہاں کا خاندانی نظام بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا ہے یا پھر مصنوعی سانسوں پہ زندہ ہے۔

میں نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ جب میں سان فرانسسکو ائیر پورٹ پہ چیک ان کے لیئے لاونج میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہایت کشادہ لاونج میں چاروں جانب ریڈیو سجے ہوئے ہیں،

سان فرانسسکو ایئرپورٹ کے لاؤنج میں رکھے ہوئے تاریخی اہمیت کے مختلف ریڈیو سیٹ

یہ ایک غیر معمولی ڈسپلے تھا جہاں ریڈیو کے ابتدائی ماڈلز سے لیکر آج تک کے ماڈلز موجود تھے۔ بلا مبالغہ ان ریڈیو سیٹس کی تعداد سینکڑوں میں تو ہوگی۔ جا بہ جا تصاویر آویزاں تھیں جن سے ریڈیو کے عروج کا دور اور اس زمانے میں لوگوں کی ریڈیو سے گہری وابستگی اور دلچسپی ظاہر ہوتی تھی۔ ریڈیو کی تاریخ، ایجاد کا پس منظر، مارکونی کا دورہء امریکہ، مختلف حالات میں ریڈیو کا کردار، حالت جنگ میں ریڈیو، حالت امن میں ریڈیو، نازیوں کا ریڈیو، اتحادیوں کا ریڈیو۔۔کیا نہیں تھا یہاں۔۔معلوماتی کیپشنز میں لفظ ''ٹرانزسٹر'' بار بار پڑھا تو یہ بھولا بسرا لفظ پھر سے یاد آ گیا۔ ایک زمانے میں ریڈیو سیٹ کے لیے ٹرانزسٹر ہی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔

ریڈیو کے حوالے سے منعقد ہونے والی اس نمائش میں میری حالت دیدنی تھی....نہ فلائیٹ چھوڑ سکتا تھا نہ نمائش.....کرتا تو کیا کرتا۔جلدی جلدی کچھ تصویریں بنائیں اور کاونٹر کی طرف بھاگا۔ شکر ہے تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد آخری مسافر کے طور سے لے لیا گیا۔ یونائیٹڈ ائیر لائن کے جہاز میں داخل ہوا تو جہاز میں ائیر لائن کے وہ ریڈیو کمرشل سنائی دیئے جو آج سے ساٹھ یا ستر سال قبل کبھی ریڈیو پہ چلتے ہوں گے۔

مجھے بھی اپنا بچپن یاد آ گیا اور آتا چلا گیا۔الف سے اچھی ہوتی ہے ڈال سے ڈالرا نک....چائے چاہئے ،کون سی جناب...میں خادم ہوں سب کا فنس میرا نام....روشنیوں کا شہر کراچی روشن اس کا جلوہ....سعید غنی کی بنارسی ساڑھیاں....ٹینو پال اور نہ جانے کیا کیا....ایک جھڑی سی بندھ گئی۔

ریڈیو سے میرے اس تعلق اور جنون کی ایک وجہ تو ماضی کی یادوں سے میرا جڑا ہونا ہے لیکن اس سے ہٹ کر بھی کچھ اسباب ہیں۔ بزم طلبا سے میرا دیرینہ تعلق۔۔خود ریڈیو سے متعلق میرے دوست اور احباب کا وسیع حلقہ۔۔یونی ورسٹی میں کئی سالوں تک ریڈیو کی تاریخ اور پروڈکشن کی تدریس سے وابستگی۔

کراچی میں جاوید جبار صاحب نے ریڈیو کی سو سالہ تاریخ پر سہ روزہ کانفرنس کا انعقاد کروایا تو میں نہ صرف ان کے ساتھ کانفرنس کی تیاریوں میں شامل رہا بلکہ کانفرنس کا پہلا تحقیقی مقالہ بھی میں نے پڑھا۔ یوں گویا یہ سارے تعلق مل جل کر میرا جنون بن گئے۔ اس نمائش کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکنے کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ یہاں صرف دیکھنے ہی کو نہیں پڑھنے کو بھی بہت کچھ موجود تھا۔

میرا جہاز نیو جرسی پہ لینڈ کر چکا ہے۔ میرا وجود نیو جرسی میں لیکن میری روح ابھی تک سان فرانسسکو میں ہے۔ آپ امریکہ جائیں تو سان فرانسسکو ضرور جائیں۔ یہاں دیکھنے، جاننے، سمجھنے اور نئے مشاغل اختیار کرنے کو بہت کچھ ہے۔ محض آئی ٹی انڈسٹری کی وجہ سے یہاں کی آمدنی (فی فرد) دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں موجود آرٹ اور سائنس کے میوزیم آپ کو حیران کیے دیتے ہیں۔ Place of Fine Arts، سان فرانسسکو میوزیم آف آرٹ اور Exploratarium آپ نے نہ دیکھے تو پھر دیکھا ہی کیا۔ گولڈن گیٹ، بے برج اور یہاں کے پارکس کے متعلق ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں جہاں پانچ سو سے زیادہ اقسام کے پودے اور سینکڑوں اقسام کے درخت پائے جاتے ہیں۔ سان فرانسسکو بے پہ واقع سمندر کے اندر ایک چھوٹا سا جزیرہ جس کا نام Alcatraz Island ہے۔ یہ جزیرہ کبھی امریکہ کے غیر معمولی حساس قید خانوں میں شمار ہوتا تھا مگر 1963 میں قید خانہ ختم کر کے سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ایک طرح کی تفریح گاہ بنا دیا گیا۔

سان فرانسسکو جائیں تو وہاں کیبل کارز میں بیٹھنا نہ بھولیں۔ ٹرام نما یہ کیبل کارز اس حسین شہر کے خوب صورت حصّوں کو دکھا کر آپ کی نظر کو تراوٹ اور آپ کی روح کو سرشاری نہ دیں تو کرایہ واپس۔

سفر جاری ہے.... ساتھ رہیے گا۔

بلاعنوان انعامی کہانی

پروفیسر عفت گل اعزاز

''حامد.....حامد! اُٹھو، جلدی کرو، اسکول جاؤ، دیر ہورہی ہے۔'' امی نے حامد کو زور زور سے آوازیں دیں، لیکن وہ بستر سے نہ اُٹھا اور آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

''بیٹا! جلدی اُٹھ جاؤ، شاباش!'' امی نے پیار سے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر آہستہ سے بولا: ''میں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

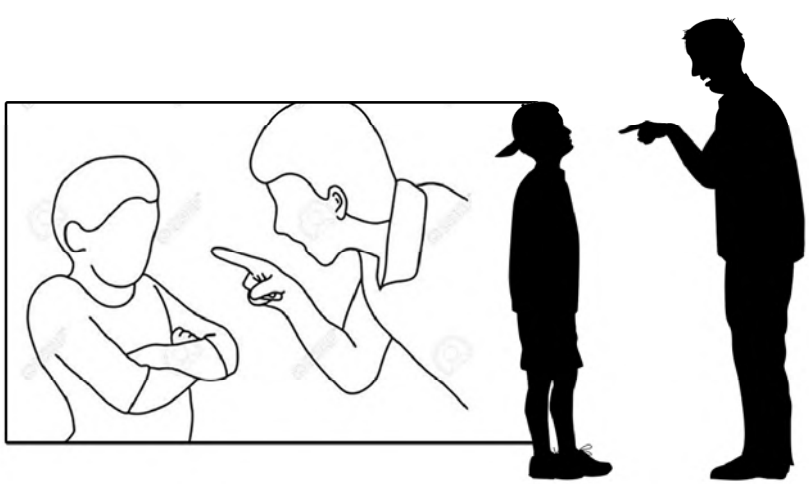

''کیوں، کیا بات ہے؟'' امی نے پوچھا۔

''کیا کرنا ہے اسکول جا کر، ایسے ہی بے کار.....اونھ۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''اسکول جاؤ گے تو کچھ پڑھو گے، لکھو گے، لائق آدمی بن جاؤ گے۔'' امی نے کہا اور باورچی خانے میں چلی گئیں جہاں چولہے پر دودھ کی پتیلی رکھی تھی اور دودھ اُبلنے ہی والا تھا۔ انھوں نے دودھ میں اُبال آنے تک انتظار کیا پھر چولہا بند کر دیا۔ اتنی دیر میں حامد کا چھوٹا بھائی خالد اسکول کا یونی فارم پہن کر امی کے پاس پہنچا اور ناشتا مانگا۔

''ہاں ناشتا تیار ہے۔ میں لاتی ہوں تم چارپائی پر بیٹھو۔'' امی نے کہا اور جلدی سے گرم گرم پراٹھے اور چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ کر خالد کے سامنے رکھ دی۔

''حامد کہاں ہے؟ کیا وہ تیار ہو گیا؟'' ابا جی نے پوچھا۔

''میں نے اسے جگایا تھا، لیکن وہ اُٹھا نہیں۔'' امی نے کہا۔

''کیوں نہیں اُٹھا؟'' ابا جی زور سے بولے: ''کیا وہ اسکول سے چھٹی کرے گا؟ دو تین دن پہلے بھی وہ اسکول نہیں گیا۔ آج بھی نہیں جا رہا؟ آخر کیوں؟'' وہ غصے سے بولے۔

''امی! حامد کہہ رہا تھا کہ اب وہ اسکول نہیں جایا کرے گا اور وہ کل بھی اسکول نہیں گیا تھا۔'' خالد نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بتایا۔

''کل صبح وہ تیار ہو کر، بستہ لے کے اسکول گیا تو تھا۔'' امی نے کہا۔

''وہ گھر سے ضرور نکلا تھا، لیکن اسکول جانے کے بجائے اسلم اور محمود کے ساتھ کھیل میں لگ گیا اور وہیں کھیلتا رہا، گھومتا پھرتا رہا۔'' خالد نے بتایا۔

''لیکن وہ گھر تو چھٹی کے وقت ہی آیا تھا۔'' امی کو یاد آیا۔

''ہاں، تاکہ آپ کو پتا نہ چلے۔'' خالد نے کہا۔

ابا جی کو یہ باتیں سن کر بہت غصہ آیا۔ وہ حامد کے پاس گئے۔ وہ ابھی تک بستر پر سو رہا تھا۔ انھوں نے اس کے کندھے پر ایک زور دار تھپڑ لگایا: ''اُٹھ جلدی.....کھڑا ہو جا فوراً۔ چل اسکول کو جا۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔

حامد جلدی سے اُٹھ گیا۔ ابا جی بہت غصے میں تھے۔ وہ مار بھی خوب زور دار لگاتے تھے۔ حامد ڈر کے مارے جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

''کل تُو اسکول نہیں گیا تھا۔ سارے دن باہر کھیلتا رہا، ہیں.....؟ تیری یہ جرأت! یہاں سے تیار ہو کر نکلا۔ ہم سمجھے تُو اسکول گیا ہے۔ دھوکا دیتا ہے ماں باپ کو؟'' ابا جی زور سے چیخے۔

حامد سہم گیا۔ وہ جلدی جلدی بستہ اُٹھانے کو دوڑا۔

''حامد! ناشتا کر لو۔'' امی نے آواز دی۔

''حامد؟ ادھر آ۔'' ابا جی نے غصے سے بھری آواز میں اسے پکارا۔ ابا جی کا سامنا کرنے کی حامد کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، لیکن ان کے پکارنے پر بھی اگر وہ سامنے نہ جاتا تو انھیں اور بھی غصہ چڑھ جاتا۔ وہ لرزتا کانپتا ابا جی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''کل تُو اسکول نہیں گیا تھا؟ کیا کر رہا تھا۔ کہاں تھا تُو؟'' انھوں نے حامد کا کان پکڑ کے پوچھا۔ کان میں سخت درد ہو رہا تھا۔

''ابا جی! میں آج جاؤں گا۔ آج اسکول جاؤں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ابا جی کے بچے! میں آج کی نہیں، کل کی بات کر رہا ہوں، کل کی۔'' وہ زور سے چیخے۔

''وہ.....وہ.....کل کام پورا نہیں ہوا تھا، اس لیے!'' وہ منمنایا۔

''کام پورا نہیں ہوا تھا؟ کیوں نہیں ہوا تھا؟ کھیلتا رہے گا تو کام پورا کیسے ہوگا؟ تجھے کچھ خبر ہے کہ تم بھائی بہنوں کے لیے میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ دن رات مزدوری کرتا ہوں میں۔ کمر ٹوٹ کے رہ

جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں تھک جاتے ہیں۔ میں نہیں پڑھ سکا۔ جاہل رہ گیا میں، مگر چاہتا ہوں کہ تم دونوں بھائی تو پڑھ لکھ جاؤ۔ کسی قابل بن جاؤ۔ دس جماعتیں تو پاس کرلو! لیکن تمھیں تو اس کا احساس ہی نہیں۔'' وہ دُکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''ابا جی! میں پڑھوں گا!'' حامد نے وعدہ کیا۔

''یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ بتا رہا ہوں تجھے!'' ابا جی نے کہا۔

''جائے گا، جائے گا۔ اب یہ اسکول جائے گا۔'' امی نے اس کی طرف سے ابا جی کو یقین دہانی کرائی۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ صبح صبح حامد کی پٹائی ہوگئی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی ہوگئی۔

''چل ناشتا کرلے۔ میرا بچہ!'' امی نے پیار سے کہا۔

خالد کھانا ختم کر چکا تھا اور حامد کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''میں نہیں کرتا!'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ امی سے کب ڈرتا تھا۔

''کھائے گا نہیں تو بھوک لگے گی! پھر پڑھے گا کیسے؟'' امی نے کہا۔

''میں جا رہا ہوں۔'' اس کے چہرے پر ناراضگی تھی۔ وہ بستہ اُٹھا کے خالد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ امی آوازیں دیتی رہ گئیں۔ گھر سے نکل کے چند قدم چلنے کے بعد اس نے خالد کا بازو پکڑ کر غصے سے پوچھا: ''تُو نے بتایا تھا ابا جی کو؟''

''کیا؟ کون سی بات؟'' خالد نے پوچھا۔

''یہی کہ میں کل اسکول نہیں گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

خالد خاموش رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ حامد اب اسے مارے گا۔ حامد اس سے عمر میں دو سال بڑا تھا۔

''میری شکایت لگاتا ہے؟'' حامد نے اسے ایک تھپڑ لگایا۔

''میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔'' خالد نے کہا۔

''بڑا آیا سچا بننے والا۔'' حامد نے منہ بنا کے کہا۔

دونوں بھائی ناراض ناراض سے راستہ طے کر رہے تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسکول آ گیا۔ حامد کا دل چاہا اسکول کے گیٹ میں داخل ہونے کے بجائے یہاں سے واپس مڑ جائے وہ باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ ایک دم خالد نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

حامد جلدی سے گیٹ کے اندر چل پڑا۔

''گھر جا کر یہ پھر شکایت کر دے گا۔'' حامد نے سوچا۔

خالد اپنی کلاس کی طرف مڑ گیا اور حامد اپنی کلاس میں چلا گیا۔ ابھی دعا نہیں ہوئی تھی۔ سب لڑکے اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسے بوریت ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا اب اسکول لگے گا۔ ماسٹر صاحب کلاس میں آئیں گے۔ وہ سب لڑکوں سے سوال پوچھیں گے، بہت سے لڑکے انھیں صحیح جواب دیں گے، مگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے گا، کیوں کہ اسے کبھی سبق یاد نہیں ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب کان پکڑ کر کھڑا کر دیں گے یا اس کی پٹائی ہوگی۔ پھر کلاس کے لڑکے اس کا مذاق اُڑائیں گے۔ یہ سب کچھ اسے بُرا لگتا تھا۔ اس کے نزدیک اسکول جانا ایک بے کار کا معاملہ تھا۔ پتا نہیں اسکول کھولے کیوں گئے ہیں اور یہاں بچوں کو بھیجا کیوں جاتا ہے۔ اس لیے کہ ماسٹر صاحبان ان کی درگت بنائیں، انھیں ماریں، پیٹیں اور سزا دیں۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

حساب کے پیریڈ میں سوال نہ کرنے پر اُسے مار پڑی۔ تاریخ کے ماسٹر صاحب نے اُسے مرغا بنا دیا، کیوں کہ اسے سبق یاد نہ تھا۔ اردو کے پیریڈ میں خیر گزری۔ سائنس کے پیریڈ میں بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ آخری پیریڈ میں اسے باتیں کرنے کی وجہ سے کھڑا کیا گیا۔ چھٹی کی گھنٹی بجی تو اس نے شکر ادا کیا۔ لڑکے چیختے، شور مچاتے کلاسوں سے نکلے۔ حامد بھی اسکول سے باہر آیا۔ وہیں خالد کھڑا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے بغیر ہی اکیلا گھر کی طرف چل دیا۔ کچھ دور چل کر وہ گھر کے قریب

گلی میں پہنچا۔ وہاں اسلم کھڑا تھا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں۔

''آج تُو چلا گیا تھا اسکول؟'' اسلم نے پوچھا: ''تُو تو اسکول چھوڑنے کو کہہ رہا تھا۔''

''ہاں.....ابا جی نے مارا تھا صبح صبح۔'' اس نے بتایا۔

''پھر تُو ڈر گیا؟'' اسلم نے اس کا مذاق اُڑایا: ''ارے جا بزدل کہیں کا۔''

حامد نے سر جھکا لیا۔

''میں تو صبح سے کھیل میں لگ گیا۔ کلیم اور آفتاب کے ساتھ جا کے خوب امرود توڑے، بڑے میٹھے امرود تھے۔ ہم خوب کھیلتے پھرے۔ بڑا مزہ آیا۔'' اسلم نے بتایا: ''اگر تُو بھی ہمارے ساتھ ہوتا تو اور مزہ آتا۔''

''ابا کہتے ہیں کہ پڑھو۔ دس جماعتیں تو پڑھو۔'' حامد نے کہا۔

''اباؤں کا کیا ہے، وہ تو یونہی کہتے ہیں۔ میرا ابا بھی کہتا رہتا ہے۔'' اسلم نے لاپراوہی سے کہا اور ہنسنے لگا۔

اسلم کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ نہ وہ کتابیں کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتا، نہ سبق یاد کرتا۔ ایسے لاپرواہ اور کام چور لڑکوں کو استاد بھی پسند نہیں کرتے۔ انھیں استادوں سے جب زیادہ ڈانٹ پڑتی ہے تو وہ لڑکے اسکول ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چناں چہ اسلم نے بھی یہی کیا۔ اسے بس کھیلنا کودنا پسند تھا۔ وہ گھر سے باہر سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا پھرتا اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرتا پھرتا تھا۔ کسی کام کاج سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ہر کام اسے مشکل لگتا تھا۔ اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا، اب وہ یہ چاہتا تھا کہ حامد بھی اسکول جانا چھوڑ دے تب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ہر وقت کھیلے کودے اور آوارہ گردی کرتا پھرے۔ وہ اکثر حامد سے کہتا کہ اسکول جانا بے کار ہے۔ وہاں سوائے ڈانٹ ڈپٹ اور مار پٹائی کے اور کیا رکھا ہے؟ وہ ہر روز حامد کو اس بات پر اُکساتا کہ وہ اسکول چھوڑ دے۔

حامد کو اسلم کی باتیں درست معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہونے لگا، لیکن مشکل یہ تھی کہ امی اور ابو اسے ہر حال میں پڑھانا چاہتے تھے۔ اس کے ابو ایک بڑھئی تھے جو لکڑی کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنی محنت مزدوری سے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک اور بعض اوقات رات گئے تک مزدوری کرتے تھے۔ کبھی تھوڑے روپے ملتے کبھی کچھ زیادہ۔ گھر میں گزارہ تو ہو رہا تھا، لیکن کافی مشکلوں سے پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں، کسی لائق بن جائیں اور بڑے ہو کر وہ خوش حال زندگی گزاریں۔ ان کی طرح زندگی کی ضروریات کے لیے مشکلیں نہ اُٹھاتے پھریں۔ وہ بچوں کی تعلیم کے لیے زیادہ محنت کرتے تاکہ انھیں اسکول کا یونی فارم دلوا سکیں، ان کے اسکول کی فیس ادا کر سکیں اور کتابیں کاپیاں خرید سکیں۔ وہ ہر تکلیف خوشی خوشی اُٹھا رہے تھے کہ ان کے بچوں کا مستقبل سنور جائے، لیکن اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ حامد کا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بات ان کے لیے بہت فکر مندی کا سبب تھی۔ انھوں نے حامد کو پیار سے سمجھایا۔ اسے علم کی اہمیت کا احساس دلایا۔ پڑھے لکھے انسان کی کامیابی اور خوش حالی کا نقشہ کھینچا اور جاہل انسان کی مشکلوں اور محرومیوں کے بارے میں سمجھایا۔ وہ ہوں ہاں تو کر دیتا، لیکن اس نے دل لگا کر پڑھنے کے بجائے آئے دن اسکول سے چھٹی کرنے کا وطیرہ اپنائے رکھا۔ مجبور ہو کر انھوں نے حامد کی پٹائی کی۔ حامد پر مار پٹائی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مار کھاتا رہتا، لیکن اسکول جانے کو تیار نہ ہوتا۔

اس کی امی اسے بہت سمجھاتی تھیں کہ وہ اپنے ابا کی بات مانے اور شوق سے اسکول جائے، لیکن وہ کسی طرح نہ مانتا۔ اب وہ گھر سے نکل جاتا اور اسلم کے ساتھ مل کر کھیل تماشوں میں لگ جاتا۔ بھوک لگتی تو گھر کا رُخ کرتا۔ ماں بُرا بھلا کہتی۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتی، لیکن وہ تہیہ کر چکا تھا کہ بالکل نہ پڑھے گا۔ آخر سب مایوس ہو گئے۔ اب وہ گھر میں بھی کوئی کام نہ کرتا۔ بس اِدھر اُدھر پڑا

رہتا۔اس کے دوست اسے بلاتے تو وہ کئی کئی گھنٹوں تک باہر کھیل کود میں لگا رہتا۔فضول مشاغل میں اپنا وقت گنواتا۔وہ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ رہ کر گالیاں دینا بھی سیکھ گیا اور پھر اس نے صبح سے شام تک گھر سے باہر خود بھی آوارہ گردی شروع کر دی۔لڑائی جھگڑوں میں لگ گیا۔کبھی خود مار کھائی کبھی دوسروں کو مارا پیٹا۔اس کی بدتمیزی کی شکائتیں ابو کے پاس پہنچتیں۔وہ بہت پریشان ہو جاتے۔انھیں غصہ آ جاتا۔وہ حامد کو خوب مارتے۔ان کے ہاتھ میں جوتا یا لکڑی کی لاٹھی، جو کچھ ہوتا وہ اس سے حامد کی مار لگاتے۔حامد ہائے ہائے کرتا۔روتا چیختا اس کے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑ جاتے۔امی کو اس پر غصہ بھی آتا اور ترس بھی آتا کہ اس طرح یہ بُری عادتیں اپناتا چلا جائے گا تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔تب کیا کرے گا یہ؟

جب حامد کی بُری عادتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی تو ابو نے مجبوراً اسے ایک دکان پر ملازم کرا دیا۔اب وہ صبح سویرے دکان پر جاتا اور شام کو اس کی چھٹی ہوتی۔اس کو معمولی سی اُجرت ملتی۔ابو کے ایک دوست نے کہا: ''اس طرح تو حامد کو بہت کم پیسے ملتے ہیں انسان کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہو تو وہ زیادہ پیسے کما سکتا ہے۔تم اسے موٹر گاڑیوں کی ورک شاپ پر لگا دو۔وہاں یہ گاڑیوں کی مرمت کرنا سیکھ لے گا اور اسے پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔ابو نے سوچا، بات تو ٹھیک ہے۔تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد انھیں قریب ہی ایک ورکشاپ پر حامد کے لیے کام مل گیا۔اب حامد دن بھر وہیں رہتا اور کام سیکھتا۔شروع میں اسے مشکل پڑی۔استاد اسے خوب ڈانٹتا اور خوب کام کرواتا۔حامد کا دل چاہتا کام چھوڑ کے بھاگ جائے، لیکن اب بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا۔

گھر میں امی کا غصہ اور ابو کی مار پٹائی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔اس کا دل ناخوش رہتا۔وہ اکثر اپنے بھائی خالد کو دیکھتا جو صبح صبح صاف ستھرا یونی فارم پہن کر بستہ سنبھال کر خوش خوش اسکول جاتا۔جب دیکھو وہ کتابیں پڑھتا نظر آتا یا کچھ لکھ رہا ہوتا۔خالد کو پڑھنا اچھا لگتا تھا۔اسے کتابوں،

کاپیوں اور اسکول سے محبت تھی۔ وہ اپنے استادوں کا نام عزت سے لیتا تھا۔ حامد کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ خالد بے وقوف سا لڑکا ہے، لیکن اب ورک شاپ پر دوسرے لوگوں کی گاڑیوں کی مرمت کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے خالد بڑے فائدے میں رہا۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا۔ افسر لگ جائے گا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جایا کرے گا۔ اس کی شان ہوگی اور لوگ اس کی عزت کریں گے۔ اسے سلام کریں گے۔ اس کا اچھا سا گھر ہوگا۔ گاڑی ہوگی۔ وہ لائق اور قابل بن جائے گا اور وہ خود کیا کرے گا؟ وہ عمر بھر خالد جیسے صاحب لوگوں کی گاڑیوں کو دھکا لگائے گا۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوں گے، پیٹرول کی دھبوں اور میل سے سیاہ کپڑے ،جن سے بدبو آتی رہتی ہے۔ یہ کیا ہوگیا؟ یہ میں کس طرف چلا آیا۔ کیا میں روشنی کے رستے سے ہٹ کر اندھیری دنیا میں چلا آیا؟ یہ کیا ہوا؟ کیا اب کچھ ہوسکتا ہے؟ پتا نہیں۔ اب بھلا میں کیا کرسکتا ہوں! وہ اکثر انہی سوچوں میں گم رہتا۔

ورکشاپ کے پاس ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر چاچا الیاس بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ ایک گاڑی کی مرمت میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ دو لڑکے وحید اور عادل بھی کام کر رہے تھے۔

''جمشید بابو کہاں ہیں؟'' چاچا نے پوچھا۔

جمشید بابو ورکشاپ کے مالک تھے۔

''وہ تو ابھی آئے نہیں۔ کیوں کوئی کام ہے چاچا؟'' وحید نے پوچھا۔

''ہاں مجھے خط پڑھوانا ہے۔ گھر سے خط آیا ہے۔''

''تُو پڑھ دے۔ تجھے تو دو چار لفظ پڑھنے آتے ہیں نا۔'' وحید نے حامد سے کہا۔

حامد کو تھوڑا سا فخر محسوس ہوا جیسے وہ ان تمام موجود لوگوں سے زیادہ عالم و فاضل بن گیا ہے۔

''مجھے اچھا پڑھنا نہیں آتا۔'' حامد نے انکساری سے کہا۔

''پڑھنا تو آتا ہے نا۔'' عادل نے رشک سے کہا، کیوں کہ وہ بھی پڑھائی سے بالکل ناواقف تھا۔

''لے بیٹا! تُو ہی پڑھ دے۔'' چاچا نے جیب میں ہاتھ ڈال کے خط نکالتے ہوئے کہا۔

حامد نے کچھ جھجکتے ہوئے خط ہاتھ میں لیا۔ اس نے ایک طرف کو ہو کر خط پڑھنا شروع کیا، لیکن وہ پہلی ہی لائن پر اٹک گیا۔ مشکل سے الفاظ تھے، جو اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ ٹھیک طرح نہ پڑھ سکا۔

چاچا کہنے لگے: ''نہ بیٹا! تُو رہنے دے۔ تجھے پڑھنا نہیں آتا۔'' انھوں نے خط اس کے ہاتھ سے پکڑ کر تہ کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔ حامد شرمندہ سا ہو گیا۔

''ابے جا..... ہم تو سمجھے تھے کہ تجھے پڑھنا آتا ہے۔'' وحید نے کہا اور ہنسنے لگا۔

''تو بھی ہمارے جیسا نکلا۔'' عادل بولا: حامد کی نظریں جھک گئیں۔

چاچا وہیں بیٹھ کر کچھ دیر جمشید بابو کا انتظار کرنے لگا، لیکن وہ نہ آئے تو چاچا اُٹھ کر چلا گیا۔

دو ایک گھنٹے بعد چاچا پھر آئے۔ جمشید بابو کے پاس کئی افراد کھڑے تھے اور وہ بہت مصروف تھے۔ کاروبار کے بارے میں مختلف باتیں ہو رہی تھی۔ چاچا الیاس اندر کمرے میں گئے۔ کچھ دیر کھڑے انتظار کرتے رہے۔

''ہاں چاچا! کیا بات ہے؟'' جمشید بابو نے ان کی طرف نظر اُٹھائی اور پوچھا۔

''صاحب! ذرا خط پڑھوالانا تھا۔''

''نہیں..... ابھی مجھے فرصت نہیں۔ تم پھر کسی وقت آنا۔''

''صاحب! اس میں تو تھوڑا سا وقت لگے گا۔ تم ابھی پڑھ دو نا۔'' چاچا نے التجا کی۔

''چاچا! ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اس وقت تم جاؤ، تم پھر آ جانا۔'' جمشید بابو نے ناگواری سے کہا اور اپنے مہمانوں سے بات کرنے لگا۔ چاچا مایوس ہو کر باہر آ گئے۔ حامد یہ سب بات چیت سن رہا تھا۔ اسے چاچا سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ کاش وہ ان کی مدد کر سکتا، لیکن اسے تو

پڑھنا تک نہیں آتا تھا۔ پھر وہ کیا کر سکتا تھا۔

''پتا نہیں خط میں کیا کیا لکھا ہے..... گھر میں کوئی پریشانی والی بات نہ ہوگئی ہو۔ خدایا خیر رکھنا۔'' وہ متفکر ہو کر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ حامد اپنے کام میں لگ گیا۔ ابھی تو اسے بہت سا کام سیکھنا تھا، اس لیے اسے کافی دیر تک کام میں لگایا جاتا تھا۔ ڈھائی تین بجے اس نے کھانا کھایا اور کونے والے کمرے میں بان کی کھردری چارپائی پر لیٹ کر سو گیا۔ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ یا شاید یہ اس کا اپنا تصور تھا۔ اس کو یوں لگا جیسے وہ چاچا کی طرح ایک خط ہاتھ میں لیے سڑک پر کھڑا ہے اور لوگوں سے التجا کر رہا ہے کہ اس کا خط پڑھ دو۔ کوئی کہہ رہا ہے، ہمیں فرصت نہیں۔ کوئی جواب دیتا ہے، ہمیں اور بھی کام ہیں۔ کوئی کہتا ہے، ہمارے پاس وقت نہیں جاؤ کسی اور سے پڑھواؤ۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ وہ کبھی ایک آدمی کے پاس جاتا ہے، کبھی دوسرے سے کہتا ہے، لیکن کوئی اس کو خط پڑھ کر نہیں سناتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں۔ وہ بے بسی سے کبھی خط کو دیکھتا ہے کبھی لوگوں کو، پھر وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔ یہ ہاتھ اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی جوانی اس کا بچپن سب کچھ ختم ہو چکے۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں کم زور ہو چکی تھیں۔ بڑھاپا، کم زوری اور ناتوانی بن کر اُسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ افسردہ ہو کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا باہر جانے لگا۔ ایک دم سے وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ تو چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ کہیں جا نہیں رہا تھا اور نہ ہی وہ ابھی بوڑھا ہوا تھا۔ ابھی تو وہ بچہ ہی تھا۔ نو دس سال کا لڑکا، لیکن مجھے خط پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔

چاچا نے بھی کہا تھا: ''تُو رہنے دے۔ تجھے پڑھنا نہیں آتا۔''

حامد ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آتا ہے مجھے خط پڑھنا آتا ہے۔ تھوڑا بہت تو آتا ہی ہے اور جو کچھ

نہیں آتا وہ میں سیکھ لوں گا۔ میں پڑھنا لکھنا سیکھ لوں گا۔ ابھی میرے پاس وقت ہے، ابھی میرے پاس وقت ہے۔ میں بوڑھا تو نہیں ہوا۔'' وہ ایک مضبوط ارادہ دل میں لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے بدن میں بجلی سے بھر گئی ہو۔ اس کے اندر ہمت پیدا ہوگئی۔ وہ باہر نکلا تو جمشید بابو ایک ایک گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ وحید اور عادل بھی ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

''اوئے چھوٹے! تُو کدھر جا رہا ہے۔ ذرا پانا اُٹھا کر دے! آ جا گاڑی بُلا رہی ہے تجھے۔'' جمشید بابو نے کہا۔

''صاحب! میں گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''گھر کیوں جا رہا ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میں پڑھوں گا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تعلیم حاصل کروں گا۔'' اس نے جوش سے کہا۔

جمشید بابو زور سے ہنسے: ''اچھا تُو تعلیم حاصل کرے گا اپنے لیے، باتیں مت بنا۔ چل اِدھر آ کر کام کر بہت کام ہے یہاں۔'' وہ رُعب سے بولے۔

''خدا حافظ صاحب!'' اس نے آرام سے کہا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ورورکشاپ کے احاطے سے باہر نکل آیا اور گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسکول جائے گا۔ خوب محنت کرے گا۔ خوب تعلیم حاصل کرے گا۔ اس رستے میں جو بھی مشکل پڑی وہ خوشی خوشی برداشت کرے گا، تاکہ کل اسے کسی کے آگے التجا نہ کرنی پڑے کہ کوئی اسے خط پڑھ کر سنا دے۔ بلکہ کل کو وہ خود دوسروں کو خط پڑھ کر سنا سکے گا۔

Press ad

Page 65

نوبل پرائز

ڈاکٹر سیدہ صدف اکبر

نوبل پرائز ایک ایسا قابل فخر انعام ہے جس کو دنیا بھر میں بے حد معتبر مانا جاتا ہے۔ نوبل پرائز کے بانی الفریڈ نوبل جو اپنے دور کے مایہ ناز موجد، انجینئر اور ماہر کیمیا تھے اور انہوں نے اپنی 335 ایجادات کے ذریعے بے پناہ دولت حاصل کی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق الفریڈ نوبل کی دولت 186 ملین ڈالر سے بھی زائد تھی۔ نوبل جو پیدا تو سویڈن میں ہوئیں مگر اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ روس میں گزارا۔ انہوں نے اپنی جمع کی ہوئی رقم کو ابتدائی پانچ انعامات کیلئے مقرر کر دیا تھا اور پھر ان کی موت کے بعد یہ انعام ہر سال ایسے خاص افراد یا اداروں کے نام دیا جانے لگا جنہوں نے فزکس، کیمیا، طب، ادب اور امن کے میدانوں میں کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

1897ء میں نوبل پرائز کا باقاعدہ آغاز ہوا اور ابتداء میں ریجنر سوہلمین اور روڈولف کو نوبل فاؤنڈیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا اور پھر ان افراد کی منظوری کے بعد ناروجین نوبل کمیٹی اور فزکس اور کیمسٹری میں رائل سوئیڈش اکیڈمی آف سائنسز بنائے گئے جبکہ فزکس اور میڈیسن میں نوبل انعام دینے کیلئے کارولنسکا انسٹیٹیوٹ کی نوبل اسمبلی اور ادب کیلئے سوئیڈش اکیڈمی کو نامزد کیا گیا جبکہ امن کے شعبہ میں ناروے کی قانون ساز اسمبلی کے منتخب کردہ پانچ افراد کی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اور پھر 1901ء میں فزکس، کیمسٹری، ادب، فزیالوجی، میڈیسن اور امن کے شعبہ جات میں نوبل انعامات دیئے گئے۔

نوبل انعام کی تقسیم کا اعلان ہر سال اکتوبر کے پہلے ہفتے میں کیا جاتا ہے اور پھر دس دسمبر کو ہر سال نوبل انعام کی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں ہر انعام یافتہ ایک طلائی میڈل، ایک عدد ڈپلوما اور کچھ مخصوص رقم ادارے سے وصول کرتا ہے۔

تاریخ میں پہلا نوبل انعام جرمنی سے تعلق رکھنے والے ول ہیلم کو دیا گیا۔ جان برڈین جو ایک ماہر فلکیات تھے انہیں فزکس میں دوبار نوبل انعام سے نوازا گیا اس کے علاوہ میری کیوری نے 1903ء میں فزکس اور پھر 1911ء میں کیمسٹری کا نوبل انعام حاصل کیا۔

فزکس کے میدان میں ابھی تک صرف تین خواتین نوبل انعام حاصل کر چکی ہیں۔ میری کیوری کے بعد ماریا جیوپرٹ نے 1963ء میں جبکہ 2018ء میں ڈونا اسٹک لینڈ نے فزکس میں نوبل انعام حاصل کئے۔

1939ء سے 1943ء تک کے دور میں کسی بھی فرد یا ادارے کو کسی بھی فیلڈ میں نوبل پرائز سے نہیں نوازا گیا جبکہ 1968ء میں بنک آف سویڈن نے نوبل پرائز کی فہرست میں معیشت کے نوبل پرائز کے اضافے کا اعلان کیا۔

کوالا

سیّدہ نازاں جبیں کی پُر تاثر تحریر

آسٹریلیا کی قیامت خیز آگ کی نذر ہونے والی معصوم مخلوق کے نام

''مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔'' ایک کوالا نے انگڑائی لیتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

''ہاں سو جاؤ۔ میں بھی سو رہا ہوں پھر اٹھ کر کھانا کھائیں گے۔'' دوسرے کوالا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

ابھی انہیں بیٹھے ہوئے اور اونگھتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک دور سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ دونوں ایک دم بیدار ہو گئے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ کیسی آوازیں ہیں؟'' ایک کوالا نے دوسرے سے پوچھا۔

''پتا نہیں، چلو نیچے اتر کر دیکھتے ہیں۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

وہ دونوں درخت سے نیچے اتر گئے اور آگے بڑھنے لگے۔ جیسے ہی تھوڑی دور گئے تو ایک دل دہلا دینے والا منظر ان کا منتظر تھا۔ آسمان نارنجی رنگ کا ہو چکا تھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا اور سب جانور افراتفری میں ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔

''آگ۔۔۔آگ۔۔۔ بھاگو۔۔۔جلدی۔۔۔!!'' کوئی جانور ان کے قریب سے یہ کہتا ہوا بھاگ نکلا۔

''کک۔۔کک۔۔کیا۔۔۔آ۔۔آ۔۔آگ لگ گئی! مگر کیسے؟'' ایک کوالا کے منہ سے مارے

خوف کے بے ربط الفاظ نکلے۔

''بھاگو۔۔جلدی بھاگو۔۔۔جلدی کرو۔'' دوسرا کوالا اپنے ساتھی کو کھینچتا ہوا بھاگنے لگا۔

اچانک آگ کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ان کی طرف لپکا۔وہ دونوں بری طرح سٹپٹا گئے اور جان بچانے کے لئے اندھا دھند بھاگنے لگے۔وہ اپنی دانست میں بہت تیز بھاگ رہے تھے مگر ہائے ری قسمت! وہ شعلہ ان سے زیادہ تیز رفتار نکلا اور دونوں کو آدبوچا اور دونوں کوالا کے ہاتھوں اور پیروں کو جلا ڈالا۔دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔آن کی آن میں اس تباہ کن آگ نے پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔وہ دونوں معصوم کوالا بہت ہی سہم گئے تھے۔کہیں سے جانوروں کے رونے اور چیخنے کا شور سنائی دے رہا تھا،کہیں سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں تو کہیں درختوں کے پتے اور جھاڑیاں جھلس رہے تھیں اور جل جل کر گرتے ہوئے قد آور درختوں نے تو دونوں معصوم کوالا کو شدید خوف زدہ کر دیا تھا۔''امی۔۔۔امی۔۔۔کہاں ہیں آپ؟ ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے پلیز ہمارے پاس آجائیں۔'' ایک کوالا نے روتے ہوئے اپنی ماں کو آواز دی۔

''ابو۔۔۔ابو۔۔یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ پلیز ہمیں بچالیں۔'' دوسرا کوالا بھی مدد کے لئے اپنے باپ کو پکارنے لگا۔مگر کوئی نہ آیا۔نہ جانے ان کے والدین کہاں تھے۔کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے کئی کوالا اور دوسرے جانور جل کر ختم ہو گئے!

وہ دونوں معصوم کوالا ڈرے سہمے بھاگتے رہے اور شدید خوف میں مبتلا ہوتے رہے۔جان تو سب ہی کو پیاری ہوتی ہے آخر۔ایسی خوف ناک آگ انھوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔وہ دونوں کوالا زور زور سے رونے لگے اور اپنے ماں باپ کو یاد کرنے لگے اور ساتھ ہی آسمان کی طرف منھ کر کے دعائیں مانگنے لگے۔

کوالہ (ایک ریچھ نما جانور) درختوں پر رہنے والا آسٹریلیا کا مقامی جانور ہے۔یہ سبزی خور ممالیہ ہے۔کوالا جنوبی آسٹریلیا،کوئنز لینڈ،نیو ساؤتھ ویلز اور وکٹوریہ میں پایا جاتا ہے جو کہ آسٹریلیا کے مشرقی اور جنوبی ساحلی علاقے ہیں۔یہ اپنی جسامت اور نقوش کے اعتبار سے آسانی سے پہچانا جا

سکتا ہے۔ یہ بغیر دُم والا ایک ہٹا کٹا جانور ہے۔اس کا سر بڑا، کان نرم ملائم اور ناک چمچے کی شکل سے ملتی جلتی ہے۔کوالا کے جسم کی لمبائی 60 سے 85 سینٹی میٹر ہوتی ہے اور اس کا وزن 4 سے 15 کلو ہوتا ہے۔اس کی کھال کا رنگ گرے اور چاکلیٹی براؤن ہوتا ہے۔کوالا مشرقی آسٹریلیا میں رہتے ہیں جہاں یوکلپٹس کے درخت وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ان کے تیز پنجے اور پیروں کی انگلیاں آسانی سے انہیں اونچائی پر رکھتی ہیں۔کوالا کے لیے یوکلپٹس کے درخت ہی سب کچھ ہیں۔یہ خوراک کے طور پر اس کے پتے کھاتے ہیں اور زیادہ پانی بھی نہیں پیتے کیوں کہ زیادہ تر نمی ان کو یوکلپٹس کے پتوں سے مل جاتی ہے۔ ہر ایک کوالا بہت زیادہ مقدار میں ان پتوں کو کھاتا ہے۔

جنگل کی اس خوفناک آگ سے جنوبی آسٹریلیا میں کم از کم 25,000 کوالا موت کے منہ میں چلے گئے! جس کے نتائج اتنے تباہ کن ہیں کہ کوالا کی نسل کی ختم ہونے کا خطرہ ہے۔یہ گول مٹول روئیں والے ممالین جانور 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں اپنی کھال کے لئے وسیع پیمانے پر شکار کیے جاتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر ماحول دشمن اقدامات سے ان کی آبادی بہت کم ہو کر لاکھوں سے ہزاروں کی تعداد میں ہو گئی تھی۔

آگ ایک درخت سے دوسرے درخت تک تیزی سے پھیلتی رہی۔شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔دونوں ننھے کوالا امید و بیم کی کیفیت میں خوف و ہراس کا شکار ہو کر بیٹھے تھے کہ اچانک انھوں نے کچھ انسانوں کو اپنی جانب آتا دیکھا۔

''ارے وہ دیکھو! کچھ لوگ ہماری طرف آ رہے ہیں۔'' ایک کوالا نے دوسرے سے کہا۔

''یہ لوگ کیوں آ رہے ہیں؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' دوسرے کوالا کے لہجے میں خوف تھا۔

دونوں کوالا بچے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ لوگوں کو اپنے قریب آتا دیکھ کر دوبارہ رونے لگے۔اتنے میں وہ لوگ ان کے نزدیک پہنچ گئے۔کچھ لوگوں نے کافی جانوروں کو آگ میں سے نکالا، کسی نے کپڑے ڈال کر بچایا تو کوئی پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ان دونوں کو بھی کسی نے بہت پیار سے اپنی گود میں اٹھا لیا اور جنگل سے باہر لے گئے۔باہر بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ان لوگوں کی

گود میں جا کر بچوں کا ڈر خوف جاتا رہا اور وہ قدرے پرسکون ہو گئے ، جیسے کسی پناہ گاہ میں آ گئے ہوں ۔ پھر ان لوگوں نے دونوں کوالا کے زخموں پر مرہم لگایا ، انہیں پانی پلایا اور دوائیں بھی دیں ۔ یہی عمل باقی تمام جانوروں کے ساتھ کیا گیا۔ دونوں کوالا مارے تشکر کے ان لوگوں سے لپٹ گئے جیسے کہ ان کا شکریہ ادا کر رہے ہوں ۔ پھر ان دونوں کوالا اور دوسرے جانوروں کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد کچھ لوگ پھر سے جنگل کی طرف چلے گئے اور کچھ وہیں موجود رہے ۔

''یہ لوگ ہمیں بچانے کے لئے آئے ہیں ۔'' ایک کوالا نے دل میں سوچا ۔

''شکر ہے اللہ ! ہم بچ گئے ۔'' دوسرا کوالا بھی دل ہی دل میں شکر ادا کر رہا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد پھر بہت سارے لوگ ایک ساتھ آتے دکھائی دیئے ۔ جب وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے تو انھوں نے قطاریں بنالیں اور پھر زمین پر جھک گئے ۔

''ارے، کیا کر رہے ہیں یہ لوگ اب؟'' دونوں کوالے حیران پریشان ہو کر سوچے جا رہے تھے ۔ پھر انہوں نے ان لوگوں کو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا ۔

''یہ لوگ دعا مانگ رہے ہیں ۔'' ایک کوالا نے دل ہی دل میں کہا ۔

اور پھر دعا ہو گئی قبول ۔ ۔ ۔ موسم بدلا اور بارش ہونے لگی ۔ یہ مسلمان تھے جو بارش کے لئے اپنے رب کے حضور ''نمازِ استسقا'' پڑھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں ۔ نمازِ استسقا بارش کے لئے پڑھی جاتی ہے ۔ جنگل کی آگ اب صرف اور صرف بارشوں سے ہی رک سکتی تھی ۔ اس نماز میں مسلمانوں کے ساتھ یہودی اور عیسائی بھی شامل ہو گئے تھے کہ اب دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ۔ بے شک انسان کے پاس تمام تر سہولیات وٹیکنالوجیز موجود ہیں مگر کبھی کبھی ایسی ناگہانی آفات آجاتی ہیں کہ انسان بے بس ہو جاتا ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی مدد نہیں کر سکتا ۔ اب بھی مسلسل بارشوں کی ضرورت ہے تا کہ جنگل کی آگ مکمل طور پر بجھ جائے اس لیے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے ۔ آیئے ہم سب بھی اللہ کے حضور دعا مانگتے ہیں کہ اللہ ان معصوم جانوروں پر رحم کرے اور جنگل کی آگ بجھ جائے ۔ آمین ۔

قدیم جاپانی فنون

عروج سعد

جاپان ہے تو ایک نہایت چھوٹا سا ملک جو دوسری جنگِ عظیم میں تقریباً تباہ ہو گیا تھا، لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد جاپانیوں نے اپنی ہمت اور علم دوستی کی بِنا پر سائنس اور ٹیکنالوجی، کے میدان میں اس قدر ترقی کی کہ ساری دنیا اُن پر رشک کرنے لگی۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ جاپانی شاید دنیا کی وہ واحد قوم ہے جس نے جدید و قدیم کو اس خوب صورتی سے اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھا ہوا ہے کہ اسے دیکھ کر ان کے سلیقے، نفاست اور جمالیاتی ذوق پر رشک آتا ہے۔ ان کے فنون اس قدر دل چسپ ہیں کہ دنیا بھر میں لوگ انھیں پسند

کرتے، سراہتے اور سیکھتے بھی ہیں۔
آیئے ان کے بارے میں آگاہی حاصل کریں۔

۱۔ بَون سائی (Bon Sai): بَون سائی کے لفظی مطلب ہیں ٹرے میں پودا اُگانا۔ اس میں فن کارانہ بات یہ ہے کہ بڑی جسامت کے درختوں کو چھوٹے چھوٹے کھلے منھ کے گملوں میں اُگایا جاتا ہے۔ ہم انھیں بونے درخت بھی کہہ سکتے ہیں۔ جن کے تنوں اور جڑوں کو مہارت اور احتیاط کے ساتھ چھانٹا جاتا ہے اور تاروں کے ذریعے سے شاخوں کو موڑ کر درخت کو کسی بھی شکل میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔ کچھ عرصے کی محنت اور دیکھ بھال سے یہ بونے درخت اتنی جاذبِ نظر شکل وصورت اختیار کرتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ مزید حیران کُن بات یہ ہے کہ اگر پھل اور پھول دار درختوں کو بون سائی کی شکل دی جائے اور مناسب نگہداشت کی جائے تو ان درختوں پر پھل اور پھول بھی لگتے ہیں۔ ذرا سوچیں ہماری کھانے کی میز پر آموں سے لدا ہوا بونا درخت اور ڈرائنگ روم کے کونے میں نیم کا بونا درخت سب کو کتنا بھلا معلوم ہوگا!

۲۔ اَوری گامی (Origami): اگر آپ کو کہیں کاغذ کا کوئی ٹکڑا نظر آئے تو آپ کیا کریں گے؟ یقیناً آپ اچھے بچوں کی طرح اُسے کوڑے دان میں پھینک دیں گے، لیکن جاپانی کاغذ کے ٹکڑوں کو پھینکتے نہیں، بلکہ انھیں انتہائی مہارت کے ساتھ خاص زاویوں سے تہ کر کے ایسی شکلوں میں تبدیل کر دیتے ہیں کہ ہم حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ فن اَوری گامی کہلاتا ہے۔ جاپانی زبان میں اس کے لفظی معنیٰ ''کاغذ کو تہ کرنے'' کے ہیں۔ یہ تقریباً ایک ہزار سال قدیم فن ہے۔ ابتدا میں اس فن کے ماہروں کو جاپان کے شہنشاہوں کے دربار میں اپنا فن دکھانے کی دعوت دی جاتی تھی، جہاں وہ بادشاہ اور درباریوں کو کاغذ موڑ کر خوب صورت پھول، پرندے اور

جانوروں کے ماڈل بنا کر حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہنر عام لوگوں میں منتقل ہوگیا۔ آج نہ صرف جاپان، بلکہ پوری دنیا میں بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی یہ فن سکھایا جاتا ہے۔ اَوری گامی خاص طور پر بچوں کے لیے ایک بہترین مشغلہ ہے۔ جس کے ذریعے بچے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے محض کاغذ سے مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں۔ یہ کاغذی چیزیں عموماً بغیر کسی قینچی یا گوند کے صرف ہاتھوں سے بنائی جاتی ہیں، یعنی ''کم خرچ، بالانشین''

۳۔ اِکے بانا (Ikebana): یہ بھی ایک خوب صورت جاپانی فن ہے، جس کے معنی ''پھولوں کی سجاوٹ'' ہے۔ یہ تقریباً پانچ سو سال قدیم ہنر ہے، جس میں پھولوں اور پتوں والی شاخیں ایسے منفرد اور دل نشین انداز میں ترتیب سے سجائی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے اَش اَش کر اُٹھتے ہیں، یہاں تک کہ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو اس مہارت سے سجایا جاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس فن کی شروعات بدھ مذہب کے مندروں میں پھولوں کی آرائش سے ہوئی۔ مندروں میں تہواروں کے موقع پر بدھ مذہب کے پیروکاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ مندروں کو پھولوں کے ذریعے بہترین انداز میں سجایا جائے۔ اس کوشش میں جاپانیوں نے پھولوں کی آرائش کے نت نئے اور اچھوتے انداز اختیار کیے جو کہ رفتہ رفتہ پوری دنیا میں جانے اور مانے گئے اور باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کر گئے۔

اِکے بانا کے فن کار اسے صرف ایک تخلیقی عمل ہی نہیں سمجھتے، بلکہ پھول پتیوں کی سجاوٹ کو وہ اپنی روحانی خوشی کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ اپنی تخلیقات کو دنیا کے سامنے پیش کر کے وہ سب کو اس خوشی میں شریک کرتے ہیں۔ کسی بھی ترتیب کو عمل میں لانے کے لیے فن کار خوب صورتی، پھولوں اور گلدانوں کی بناوٹ اور دوسری باریکیوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

آپ بھی اپنی کیاریوں سے اپنی پسند کے پھول اور ہری بھری شاخیں لائیں اور انھیں اپنی پسند اور ذوق کے مطابق ترتیب دے کر اپنے گھر کو سجائیں۔

Press ad

Page 76

۲۳ مارچ

شمس القمر عاکفؔ

یہ استقلال کا دن ہے، یہ استحکام کا دن ہے
یہ پاکستان پر اللہ کے انعام کا دن ہے

یہ دن اجداد کی قربانیوں کو یاد کرنے کا
اُنہی جذبوں سے اپنے دل کو پھر آباد کرنے کا

یہ دن ماضی کی عظمت یاد کرنے کے لیے آئے
یہ مستقبل کی شوکت کے لیے اک عزم دہرائے

سلام اپنے شہیدوں، غازیوں کے عزم و ہمت کو
سلام اُن کی وفاؤں کو، سلام اُن کی محبت کو

ہوئے قربان جو اس دیس کی تعمیر کی خاطر
سبھی کچھ وار ڈالا خواب کی تعبیر کی خاطر

یہ دن آ کر ہمارے عزم کو بیدار کرتا ہے
وفا کے امتحانوں کے لیے تیار کرتا ہے

قیامت تک یہ دن آتا رہے، آزاد ہو دھرتی
ہمیشہ شاد ہو دھرتی ، سدا آباد ہو دھرتی

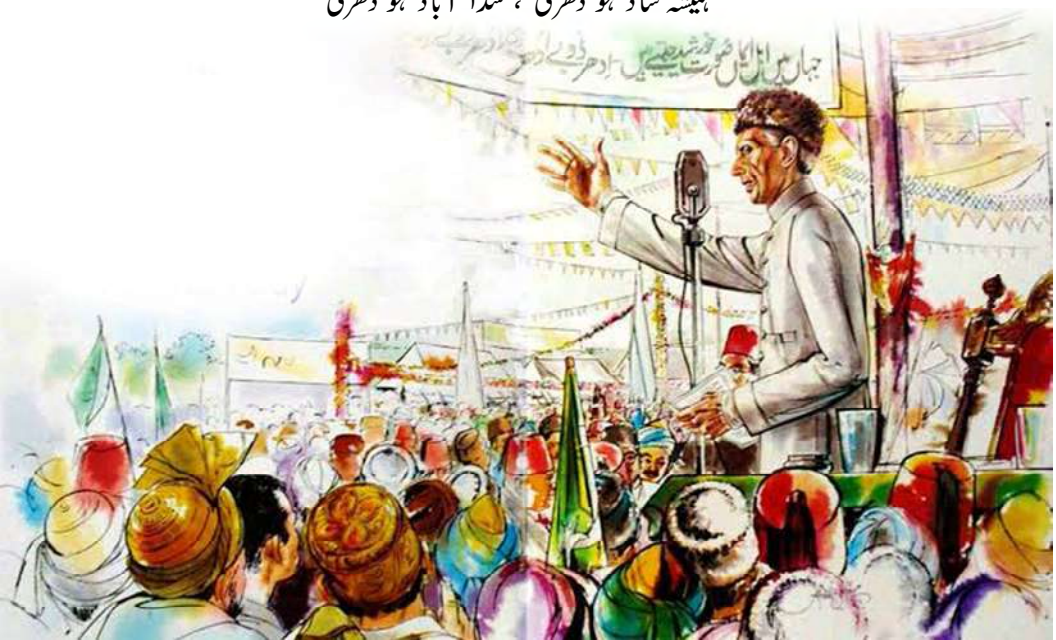

نونہال خبرنامہ

خرم فرخی

سب سے بڑا منھ

اچھے بچے بڑوں کے سامنے منھ نہیں کھولتے، لیکن امریکی ریاست ''منی سوٹا'' کے ۱۴ سالہ بچے آئسک جانسن نے اپنا بڑا سے منھ کھول کر عالمی ریکارڈ بنالیا ہے، جسے ''گینز بک ورلڈ ریکارڈ'' میں درج کرلیا گیا ہے۔اس بچے کا منھ 3.67 انچ کھلتا ہے۔اس سے پہلے یہ اعزاز جرمنی کے ایک شخص کے پاس تھا جس کا منھ 3.46 انچ کھلتا تھا۔ آئسک جانسن اپنے منھ میں ایک بڑا سیب یا برگر وغیرہ آسانی سے رکھ سکتا ہے۔

سب سے جان دار بچہ

ہر انسان کو اپنی صحت کی فکر رکھنی چاہیے۔اس کے لیے غذا کے ساتھ ورزش بھی ضروری ہے۔یہ عمل بچپن سے ہو تو بہت اچھا ہے۔روس کا سب سے جان دار بچہ گیارہ سالہ ''ٹموفی'' ہے، جس نے ۶ سال کی عمر سے ویٹ لفٹنگ شروع کردی تھی اور پچپن کلو کا وزن اُٹھا کر سب کو حیران کردیا تھا۔

اب گیارہ سال کی عمر میں اس نے ۱۰۰ کلوگرام وزن اُٹھا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ٹمو فی نے اتنی چھوٹی عمر میں ٹرک اور بڑی گاڑیاں کھینچنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

۱۵ سال کی بوڑھی

اللہ سب کو بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ چین کے شمال مشرقی حصے میں ''ہیشان'' کاؤنٹی کی پندرہ سالہ لڑکی ''شیافینگ'' ایک ایسی عجیب بیماری میں مبتلا ہے جو بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ ۱۵ سال کی عمر میں ساٹھ سال کی بوڑھی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑنے کے ساتھ جِلد بھی پوری طرح ڈھلک چکی ہے۔ اس بیماری نے شیافینگ کی روز مرہ زندگی کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔

نیند کا ڈبا

بے گھر افراد دنیا میں تقریباً ہر جگہ ہوتے ہیں۔ جرمنی کی ریاست ''ورٹمبرگ'' کے ایک شہر ''الم'' کی انتظامیہ نے اپنے بے گھر شہریوں کے لیے کیپسول نما سلیپنگ باکس تیار کیا ہے۔ اس کے اندر شدید سرد راتوں میں بھی بے گھر افراد محفوظ اور آرام دہ نیند لے سکیں گے۔ اس باکس کی تیاری میں لکڑی اور دھات کا استعمال کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کے اندر سونے والے ٹھنڈ سے محفوظ رہیں گے۔

وفادار سادھو

محمد ذوالقرنین خان

چاکر بلوچ بہت ماہر تیرانداز تھا۔ وہ منصور الملک کی فوج میں معمولی سپاہی بھرتی ہوا تھا مگر اس کی تیر اندازی اس کے کام آئی اور جلد ہی اسے پچاس تیراندازوں کا امیر بنا دیا گیا۔ وہ بہت تندہی سے سرحد پر اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ کبھی کبھار چھٹی مل جاتی تو گھر بھی چلا جاتا۔ اس کا خواب تھا وہ ایک ہزاری کمان دار بنے۔ اس کی کمان میں ایک ہزار تیرانداز سپاہی ہوں۔ ایک روز اسے خط کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ اس کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے۔ یہ پڑھ کر اس نے فوراً گھر

کی راہ لی۔ اسے کچھ دن ہی ان کی خدمت کا موقع ملا تب موت نے انہیں آ لیا۔ اب گھر میں کمزور بوڑھی ماں رہ گئی تھی۔ ایک جانب اس کا خواب تھا دوسری جانب کمزور بوڑھی ماں۔ فیصلہ کرنے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ اس نے فوج کو خیر باد کہہ دیا اور کھیتی باڑی کرنے لگا۔

ماں نے ایک لڑکی پسند کی اور چاکر بلوچ کی شادی ہوگئی۔ زندگی خاموشی سے آگے بڑھ رہی تھی جب منصورالملک کے ہاں دس سال بعد بیٹا پیدا ہوا ملک بھر میں جشن کا سماں تھا۔ کھیلوں کے مقابلوں کا انعقاد کیا جا رہا تھا۔ ان دنوں چاکر بلوچ کو بھی کچھ فراغت تھی تو ایک مرتبہ پھر تیر کمان اٹھانے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ گاؤں والوں کا بھی خیال تھا کہ اسے ان مقابلوں میں حصہ لینا چاہیے۔ کچھ مشق کے بعد اس کا تیر عین نشانے پر لگنے لگا۔

گاؤں والے اس کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تیراندازی کے مقابلے میں جب وہ تیسرے مرحلے میں داخل ہوا تو ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس دن گھر جاتے ہوئے میر طاہر نے چند محافظوں کے ہمراہ اس کا راستہ روک لیا۔ وہ اس علاقے کا داروغہ تھا۔ ''چاکر بلوچ، تمھارا نشانہ بہت سچا ہے۔'' گھوڑے سے اترتے ہوئے میر طاہر بولا۔

چاکر جانتا تھا کہ میر طاہر نے اسے کسی خاص وجہ سے روکا ہے۔ کسی راہ چلتے کی تعریف میر طاہر کی عادت نہیں تھی۔

صاحب! وہ بات کہیے جس کے لیے مجھے آپ نے روکا ہے۔ چاکر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میر طاہر کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اب اس کے چہرے پر رعونت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک ریشمی تھیلی نکال کر حقارت سے اس کی جانب بڑھائی۔

''چاکر! یہ اس انعام سے بہت زیادہ ہے جو مقابلہ جیتنے کی صورت میں تمھیں ملے گا۔ یہ رکھ لو اور اس مقابلے سے دستبردار ہو جاؤ۔''

اگر میں انکار کر دوں؟۔ چاکر نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

اس کا نتیجہ بہت بھیانک ہوسکتا ہے۔ میر طاہر نے سرد لہجے میں دھمکایا۔
میں تمھاری پیشکش ٹھکراتا ہوں۔ چاکر بلوچ نے بے خوف ہوکر کہا۔
میر طاہر اسے کچھ دیر غضب ناک نگاہوں سے گھورتا رہا پھر چابک لہراتا وہاں سے چل دیا۔
مقابلے کا دن آ پہنچا اور جب اس نے مدمقابل کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ میر طاہر کا بھانجا اور پچاس ہزاری سالار میر قاسم کا بیٹا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چاکر جیسے ماہر تیرانداز کے سامنے اس کی ایک نہ چلی وہ یہ مقابلہ ہار گیا۔
اس جیت پر پچاس ہزاری سالار میر قاسم نے چاکر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا ''ہر باپ کی طرح میری خواہش تھی کہ یہ مقابلہ میرا بیٹا جیتے مگر کچھ صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں۔ چاکر کے پاس وہ خوبی ہے جس کی بدولت اس کا نشانہ چوکتا نہیں۔ میں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ یہ مقابلہ جیت گیا تو اسے بیش قیمت تحفہ دوں گا۔ چاکر بلوچ نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ انعام کے ساتھ یہ اس تحفے کا بھی حقدار ہے۔
میر قاسم کا یہ اعلان سن کر گاؤں والوں نے خوشی سے چاکر کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ سب اس تحفے کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ تحفہ دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ ایک دیوقامت افریقی ہاتھی تھا۔
امید ہے آپ ہمارے تحفے کی قدر کریں گے اور اس کی خوراک کی فکر نہ کرنا سالانہ تمھیں اس کا خرچ مل جائے گا۔ میر قاسم نے چاکر بلوچ سے مصافحہ کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تاکہ سب سن لیں۔
چاکر کسی صورت وہ تحفہ قبول کرنا نہیں چاہتا تھا مگر میر قاسم کی دشمنی مول لینے کی سکت اس میں نہ تھی۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح وہ ہاتھی کو گاؤں لے آیا۔ ایک اجاڑ کھیت میں اس کا عارضی ٹھکانہ بنا دیا۔ اگلے دن چند سپاہی وہاں آدھمکے اور ہاتھی کی خوراک کے بارے میں چاکر سے سوال کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے چاکر کے کھیت میں گھس کر محنت سے اگائی گئیں سبزیاں اکٹھی کیں اور ہاتھی کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ایک کاغذ پر ان کی تفصیل لکھی اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ سال پورا ہونے پر اسے رقم ادا کر دی جائے گی۔ وہ روز یہی کرتے۔ چاکر کے سارے کھیت

برباد کر دیے گئے۔ وہ اسے تنگ کرنے کے لیے کبھی کہتے ہاتھی کمزور لگ رہا ہے اس کے لیے مزید خوراک کا انتظام کرو۔ کبھی کہتے صاف نہیں اسے نہلانے کا بندوبست کرو۔ چاکر اور اس کے گھر والوں کا سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ ہاتھی چاکر کے علاوہ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ اس لیے صفائی بھی اسے کرنا پڑتی۔ زندگی بہت مشکل ہوگئی تھی۔ سارے کام چھوڑ کر وہ ہاتھی کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس بات کی اکثر اپنی ماں سے شکایت کرتا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتی اور اسے بتاتی کہ صبر اختیار کرنے سے زحمت رحمت بن جاتی ہے۔

دوسری طرف اس کی حالت کا سن کر میر طاہر قہقہے لگاتا اور اپنے بہنوئی میر قاسم کی چالبازی کو سراہتا۔ ان دنوں میر طاہر کسی کام سے مرکز چلا گیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد میر قاسم کی دلچسپی بھی کم ہوگئی تو سپاہیوں نے آنا بھی کم کر دیا۔

چاکر اور ہاتھی ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے۔ ہاتھی جس کا نام اس نے سادھو رکھا ہوا تھا، ساری رات وہ ایک ہی حالت میں سر جھکائے گزار دیتا۔ سادھو اس کے اشارے سمجھنے لگا تھا۔ چاکر نے سواری بھی سیکھ لی تھی۔ وہ جب سادھو پر سوار ہوتا تو اسے بہت لطف ملتا۔ سادھو کو پانی میں اچھل کود پسند تھی۔ چاکر ہر دوسرے روز اسے جھیل کی جانب لے جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس پر سوار ہو کر جنگل میں دور تک چلا جاتا۔ وہ وہاں سے شہد اکٹھا کرتا انواع اقسام کے پھل توڑ لاتا۔ ایک مرتبہ شہد اتارتے ہوئے جب مکھیوں نے ان پر حملہ بول دیا تو تب اسے معلوم ہوا کہ سادھو بھاگتا بہت تیز ہے۔ یوں وہ اسے دوڑانے بھی لگا۔ ان دنوں وہ اس پر کھڑے ہو کر سواری کرنا سیکھ رہا تھا۔

ایک رات سپاہی آئے اور اسے بتایا کہ منگولوں نے سرحد پر حملہ کر دیا ہے۔ سالار پچاس ہزاری میر قاسم کے حکم سے وہ ہاتھی واپس لے جا رہے ہیں۔ صبح فجر تک انہوں نے ہر جتن کر لیا مگر سادھو سر جھکائے وہیں کھڑا رہا۔ سورج نکلتے ہی میر طاہر دو سو سپاہی لے کر پہنچ گیا۔ آہنی زنجیروں سے سادھو کو جکڑ دیا گیا۔ سب مل کر زور لگا رہے تھے۔ اتنے میں کسی سپاہی نے نیزے کی انی سادھو کے پاؤں میں ماری۔ سادھو بپھر گیا۔ چنگھاڑتے ہوئے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوا پھر ایک جھٹکے سے

بھاگ کھڑا ہوا۔ سپاہی اس کے ساتھ گھسٹتے چلے گئے۔ اس کا رخ جنگل کی جانب تھا۔
بادشاہ منصور الملک نے اپنے تمام پچاس ہزاری سالاروں کو مشرقی سرحد پر پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ میر قاسم نے اس مہم پر جانے کے لیے سادھو کو واپس بلوایا تھا۔ رواج تھا کہ جنگ کے دوران پچاس ہزاری سالار ہاتھیوں پر سوار رہتے تھے۔ میر قاسم کے پاس جو سب سے بڑا ہاتھی تھا وہ سادھو ہی تھا۔ وہ کسی چھوٹے ہاتھی پر بیٹھ کر بادشاہ کے سامنے جانے میں شرم محسوس کر رہا تھا۔ دس دن گزر گئے سپاہی سادھو کو نہ پکڑ سکے۔
ایک شام میر قاسم خود چاکر کے گھر پہنچ گیا۔ اسے کہا سادھو کو لے کر سرحد کی جانب چلے دوسری صورت میں اس کی ساری زمین ضبط کر لی جائے گی اور اسے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ چاکر کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ بے بس تھا۔
ایک مہینے بعد وہ سرحد پر منگولوں کے لشکر کے سامنے موجود تھا۔ چاکر میر قاسم کے فیل بان کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میر قاسم نے بہت کوشش کہ سادھو کسی اور فیل بان کو قبول کر لے مگر وہ بگڑ جاتا۔ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ منگول تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ منصور الملک کا لشکر ان حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پسپا ہو رہا تھا۔ میر قاسم اس وقت ایک اونچے ٹیلے موجود تھا اور میدان جنگ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ہوا کا رخ پہچان کر میر قاسم نے چاکر کو حکم دیا کہ ہاتھی کو خیموں کی طرف لے جائے۔
ایسا کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میر قاسم کو میدان جنگ سے جاتا دیکھ کر اس کے سپاہی حوصلہ ہار دیتے اور بھاگ کھڑے ہوتے۔ منگول اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اس طرف سے حملہ آور ہو جاتے۔ سارے لشکر میں افراتفری پھیل جاتی تب انہیں شکست سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ ہاتھی چاکر کا تھا اور چاکر میر قاسم کا سپاہی بھی نہیں تھا کہ اس کا حکم مانتا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میر قاسم نے اسے اپنے پاس رتھ میں آنے کو کہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی بات ہوئی۔
تھوڑی دیر بعد سپاہیوں نے دیکھا کہ رتھ کو ہاتھی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ فیل بان کو نیچے اتار کر ان کا سالار تیر کمان سنبھالے خود ہاتھی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ہاتھی چنگھاڑتا ہوا ٹیلے سے نیچے اترا اور

غضب ناک انداز میں منگولوں کی جانب بڑھا۔ وہ دشمن کو روندتا ہوا بہت دور تک نکل گیا۔ منگولوں نے ہاتھی کو گھیر لیا تھا اور نیزے اور تلواروں سے اس پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کا سالار ہاتھی پر کھڑا ہو کر ان پر تیر برسا رہا تھا۔ سپاہیوں نے جب یہ منظر دیکھا۔ تو نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے پر جوش انداز میں اپنے سالار کی مدد کو لپکے۔ منصور الملک جو اپنی فوج کو پسپا ہوتے دیکھ کر مایوس ہو چکا تھا یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے میر قاسم سے اس بات کی کم از کم توقع نہیں تھی۔ دوسرے سالاروں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو وہ بھی میدان جنگ کی طرف دوڑے۔ اب تمام لشکر میں ایک توانائی دوڑ گئی۔ وہ پوری قوت سے منگولوں سے جا ٹکرائے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ منگولوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جلد ہی وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

سادھو زخموں سے نڈھال تھا۔ اس پر موجود چاکر بلوچ کی حالت بھی بہت خستہ تھی۔ تیر چلا چلا کر اس کے دونوں بازو شل ہو گئے تھے انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ اس نے میر قاسم کی وردی پہن رکھی تھی۔ میر قاسم انتہائی بزدل واقع ہوا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ چاکر واپس جانے کے لیے تیار نہیں تو اسے اپنی وردی دے کر اس کی قمیص اور پگڑی خود پہن لی اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ وہ بہت مشکل سے سادھو پر سے اترا۔ دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ سادھو جیسے اس کے اترنے کا منتظر تھا پاؤں موڑ کر بیٹھا اور چند لمحوں بعد ایک طرف ڈھے گیا۔ چاکر نے جب یہ منظر دیکھا تو والہانہ سادھو کی جانب بڑھا۔ سادھو کی آنکھیں بند تھیں۔ چاکر بچوں کی طرح اس سے لپٹ کا رو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار تھی۔

چاکر بلوچ اس وقت منصور الملک کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ منصور الملک کو پہلے ہی شک تھا کہ ہاتھی پر کھڑے ہو کر تیر چلانے والا میر قاسم نہیں ہو سکتا۔ میر قاسم کو میدان جنگ سے بھاگنے کے جرم میں جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ منصور الملک چاکر کی بہادری سے حد درجے متاثر ہوا اور اسے پچاس ہزاری سالار مقرر کر دیا۔ سادھو زحمت بن کے آیا تھا مگر اس سمیت پورے ملک کے لیے رحمت بن گیا تھا۔

انعامی سلسلہ ۲۹۱

معلومات افزا

س۔ف

درجِ ذیل ۱۰ سوالات کے جوابات ۱۵/مارچ ۲۰۲۰ء سے قبل بھجوادیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا ضروری ہے۔ تمام درست جواب دینے والے پندرہ نونہال انعام کے حق دار ٹھہریں گے۔ تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں انعام کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے گا۔

۱ قرآن مجید کا ترجمہ سب سے پہلے.....زبان میں ہوا تھا۔ (اطالوی ۔ لاطینی ۔ فارسی)

۲ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ پاکستان کی نئی تنظیم کے تحت ۱۹/فروری ۱۹۴۹ء کو پہلے صدر..... بنے۔

(مسعود کھدر پوش ۔ چودھری خلیق الزماں ۔ قاضی فضل اللہ)

۳ پرتگال براعظم.....میں واقع ہے۔ (یورپ ۔ ایشیا ۔ افریقا)

۴ بابائے تاریخ (تاریخ کا نویسی کا بانی).....کو کہا جاتا ہے۔ (چارلس ڈارون۔ برٹرینڈ رسل۔ ہیروڈوٹس)

۵ اٹاوا،.....کا دارالحکومت ہے۔ (کیوبا ۔ کینیڈا ۔ بولیویا)

۶ مشہور تفریح گاہ ''ہائیڈ پارک''.....میں ہے۔ (لندن ۔ واشنگٹن ۔ ٹوکیو)

۷ ہاتھی اور دریائے بچھڑے کے بعد خشکی کا سب سے بڑا جانور..... ہے۔ (گھوڑا ۔ شیر ۔ گینڈا)

۸ فٹ بال کا پہلا ورلڈ کپ مقابلہ.....میں ہوا۔ (۱۹۱۹ء ۔ ۱۹۳۰ء ۔ ۱۹۳۶ء)

۹ اردو زبان کی ایک کہاوت ہے: ''بندر کیا جانے.....کا بھاؤ۔'' (ناریل ۔ ٹماٹر ۔ ادرک)

۱۰ مشہور شاعر سلیم احمد کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے میں اس کا.....دے رہا ہوں

(محصول ۔ لگان ۔ خراج)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۹۰ (مارچ ۲۰۲۰ء)

نام : _____

پتا : _____

عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (مارچ ۲۰۲۰ء)

عنوان : _____

نام : _____

پتا : _____

عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے نام بوجھیے (مارچ ۲۰۲۰ء)

نام شخصیت : _____

نام نونہال : _____ عمر : _____ تعلیم : _____

پتا : _____

ایک کوپن، ایک نونہال کے لیے ہے۔ ایک ہی عنوان لکھیے۔
اپنا پتا صاف اور خوش خط لکھیے۔ کوپن کو A4 سائز کے کاغذ پر چسپاں کیجیے اور
۱۵ مارچ ۲۰۲۰ تک بھجوا دیجیے۔

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری ہمدرد فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں کا ایک حصہ ہے۔ ہر مہینے پورے پاکستان میں ہزاروں مریضوں کا مفت طبی معائنہ کرنے کے بعد مفت ادویات بھی دی جاتی ہیں۔ یہ فری موبائل ڈسپنسریاں کراچی، لاہور، ملتان، بہاول پور، فیصل آباد، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، سکھر، حیدرآباد اور آزاد کشمیر میں مستحق مریضوں کے لیے مخصوص ہیں۔

کراچی کے لیے چھے گاڑیاں درجِ ذیل علاقوں میں خدمت پر مامور ہیں

غازی آباد، گلشن بہار، اورنگی نمبر 13، قائم خانی کالونی، بلدیہ ٹاؤن، نیو کراچی سیکٹر D-11، سیکٹر F-11، نئی آبادی، یوسف گوٹھ، لیاری ایکسپریس وے، خدا کی بستی، کورنگی نمبر 2، کورنگی سو کوارٹرز، کورنگی نمبر 4، ونگی گوٹھ، محمود آباد، عمر گوٹھ، ایوب گوٹھ، مدرسہ انوارالایمان، سلطان آباد، مدرسہ منبع العلوم، وھیل کالونی، اکبر گراؤنڈ، مہاجر کیمپ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 3، شفیع محلّہ (لال مسجد)، نور شاہ محلّہ، مواچھ گوٹھ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 7، مشرف کالونی بلاک سی، ایف، ای اور اے روڈ، لیاقت آباد پیلی کوٹھی، کوثر نیازی کالونی، مجید کالونی اور ملیر۔

جوابات معلومات افزا - ۲۸۹

۱۵انعام یافتہ نونہالوں کو ایک ایک کتاب روانہ کی جائے گی۔ باقی نونہالوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ محترم حافظ عبدالمجید نے یکم اگست ۱۹۰۶ء کو دہلی میں ہمدرد دواخانہ قائم کیا۔

۲۔ حکیم محمد سعید ۹/جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ اس روز جمعہ تھا اور اسلامی تاریخ ۱۷/ ربیع الثانی ۱۳۳۸ء ہجری تھی۔

۳۔ جناب حکیم عبدالحمید اپنے بھائی حکیم محمد سعید سے گیارہ سال بڑے تھے۔

۴۔ شہید حکیم محمد سعید کی اہلیہ محترمہ کا نام نعمت بیگم تھا۔

۵۔ ۱۴/اگست ۱۹۵۸ء کو کراچی میں ہمدرد طبیہ کالج کا افتتاح محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔

۶۔ شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید نے بچوں کے لیے رسالہ ہمدرد نونہال جولائی ۱۹۵۳ء میں جاری کیا۔

۷۔ ۱۷/جون ۱۹۸۵ء کو مدینۃ الحکمہ میں ہمدرد یونی ورسٹی کا سنگِ بنیاد جنرل محمد ضیاء الحق نے رکھا تھا۔

۸۔ حکیم محمد سعید نے گورنر سندھ کی حیثیت سے ۴ یونی ورسٹیوں کی منظوری دی تھی۔

۹۔ شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کو شہادت کے بعد ۱۴/اگست ۲۰۰۰ء کو نشانِ امتیاز سے نوازا گیا تھا۔

۱۰۔ حکیم محمد سعید کے یومِ پیدائش کے حوالے سے پاکستانی بچوں کا پہلا قومی دن ۹/جنوری ۲۰۰۳ء کو منایا گیا۔

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے خوش قسمت نونہال

☆ کراچی: رباب فاطمہ، حمیرا سلطان، سیدہ ماہم شاہ، صارم علی، سیدہ زینب علی، سید عفان احمد، شورۃ الزہرہ ☆ لاہور: امتیاز علی ناز، ولید اشرف ☆ حیدرآباد: مرزا حیان بیگ، امامہ تجمل ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆ میرپور خاص: جنید احمد تحسین ☆ جھنگ صدر: ارفع زینب ☆ کالا گجراں: سیماں کوثر۔

۹ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ کراچی: ایمن شیخ، تہامی رضا، ہما ساجد خان، آرز جنید، سیدہ فاطمہ شعیب، اقرا نسیم، حسان خالد، اُسید الرحمٰن، عبیرہ طیب خان، فاطمہ توقیر، حافظہ حور لائبہ خداداد، یمنیٰ شیخ، ہدیٰ ملک ☆ راولپنڈی: ہانیہ نور بٹ، ملک محمد احسن ☆ حیدرآباد: عمار خالد، نرین بانو سلیم الدین، سیدہ علیشہ زیدی ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆ ننکانہ صاحب: محمد حسن قادری ☆ اوکاڑہ کینٹ: محمد جہاں زیب، عروسہ تنزیل۔

۸ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ کراچی: علینا اختر، رقیہ محمد عقیل شاہ، عبداللہ فیصل فریدی، اسما محمد اشرف صدیقی، فرحان طاہر، حسان طاہر، علیشبہ محمد سہیل، معارج بن طارق مغل ☆ اوباڑو: احسان علی ملک، فلک رانی ☆ راولپنڈی: محمد معاذ حفیظ، ملک شاز راحمد ☆ حیدرآباد: عائشہ ایمن عبداللہ ☆ خان پور: سعید احمد ☆ کوہاٹ: عالیہ فرمان شاہ ☆ میر پور خاص: اسما خان ☆ اوکاڑہ: محمد بریر خلیل ☆ اسلام آباد: لائبہ امان ☆ میر پور: محمد مزمل احمد ☆ ڈیرہ اسماعیل خان: محمد معراج سواگ ☆ پرانا سکھر: محمد حسیب ☆ لاہور: اُسامہ ضیا ☆ ڈیرہ غازی خان: عفت سراج۔

۷ درست جوابات بھیجنے والے ذہین نونہال

☆ کراچی: احتشام الدین ☆ ڈیرہ غازی خان: علی عمران کلاچی ☆ خانیوال: محمد گورش خان ☆ جہلم: محمد حسین عارف ☆ راولپنڈی: مدثر طاہر۔

۶ درست جوابات بھیجنے والے محنتی نونہال

☆ سکھر: حدید سلیم ☆ لاڑکانہ: غلام محمد۔

تحریکِ پاکستان کا یہ غیر معروف ہیرو کون ہے؟

نام بوجھیے

سلیم فرخی

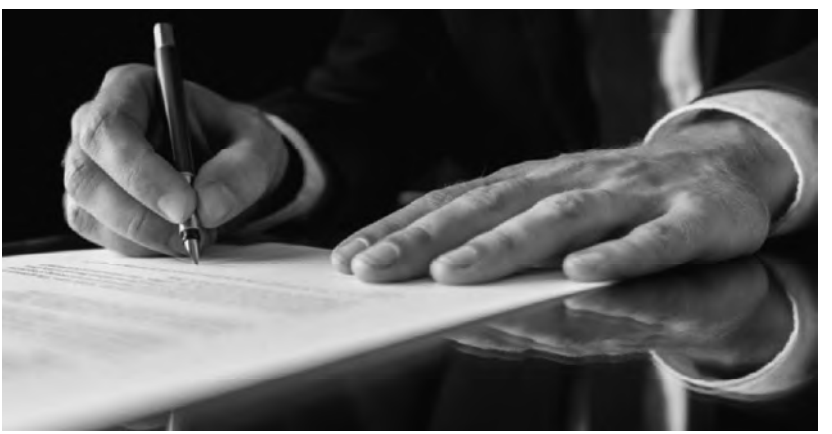

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک وطن حاصل کرنے کے سلسلے میں چلنے والی تحریک میں وہاں کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان میں وہ لوگ بھی شریک تھے جن کے علاقے پاکستان میں شامل نہ ہوسکے اور وہ لوگ بھی تھے جو ہندوستان سے باہر تھے۔میرا شمار بھی ان ہی میں ہے۔

میری ولادت ۱۶؍نومبر ۱۸۹۶ء کو موضع موہراں تحصیل گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں ہوئی۔میرے والد حاجی شاہ محمد دین دار انسان تھے اور چھوٹے زمیندار تھے۔میں ابھی بہت چھوٹا تھا، جب میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔میری پرورش میری سوتیلی ماں نے کی تھی۔گاؤں کے دستور کے مطابق مجھے سب سے پہلے قریبی مسجد میں قرآنی تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔عربی اور فارسی کی تعلیم مشہور عالمِ دین صوفی سید طبی حسین سے گاؤں کے دیہاتی اسکول سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم کے

بعد مڈل کلاس کا امتحان قریبی قصبے راہون کے اسکول سے پاس کیا۔ اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک میں پاس ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور میری علمی، نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کالج کے مجلّے ''دی کریسنٹ'' کا مدیر رہا۔ ۱۹۱۶ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۱۸ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران بزم تقریر کا سکریٹری، انٹر کالجیٹ ایسوسی ایشن کا سکریٹری اور جنگ عظیم کے وقت کالج کی ریکروٹنگ کمیٹی کا سکریٹری بھی رہا۔ ۱۹۱۵ء میں ''بزمِ شبلی'' قائم کی۔ یہ طلبہ کی سماجی اور سیاسی تنظیم تھی۔ یہیں سے میرے سیاسی کردار کا آغاز ہوا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۱۸ سال تھی۔ بزمِ شبلی کے افتتاحی اجلاس میں، میں نے کہا تھا۔ جن ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں مسلمان مذہبی، معاشی اور ثقافتی معاملات میں آزاد ہونے چاہئیں، ان علاقوں کو مسلمان ریاست بنایا جائے۔ جلد ہی اس تنظیم کے تحت مسلم طلبہ کو اسلام اور مسلمانوں کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ دورانِ تعلیم ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ دو الگ الگ قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے الگ پناہ گاہ ضرور بنانی پڑے گی۔

۱۹۱۸ء میں کالج چھوڑ کر محمد دین فوق کے اخبار ''کشمیر گزٹ'' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گیا۔ کچھ عرصہ معروف اخبار ''پیسہ'' میں بھی کام کیا۔ بعد میں ایچی سن کالج میں ٹیوٹر شپ کی ملازمت مل گئی۔ اس دوران لاء کالج لاہور سے قانون کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پھر نواب آف بہاول پور کا اُستاد رہا اور سردار دوست محمد مزاری کا سکریٹری رہا۔ میں نے مزاری خاندان کی جائداد کا جھگڑا حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس پر مجھے ساٹھ ہزار کی خطیر رقم فیس کے طور پر ملی۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔

۱۹۲۸ء میں اعلا تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہو گیا۔ وہاں کیمبرج اور ڈبلن یونی ورسٹیوں سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں، جب کہ ''لنکنز ان'' سے بار ایٹ لا کی ڈگری لی۔ دورانِ تعلیم میں نے انگریزوں کی سیاست اور سیاسی چالوں کا بہت غور سے مشاہدہ کیا۔ میں نے ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کی پوری تاریخ کا باریک بینی سے تجزیہ کیا اور اپنے وطن کو ان ظالموں سے آزاد کرانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ انگلستان میں قیام کے دوران ہی میں نے ایک الگ

مسلم مملکت تجاویز پیش کیں اور برصغیر کے طلبہ کو اپنے ساتھ ملا کر تحریک شروع کی۔
دسمبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر قائداعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال سے ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے بہت سے انگریز دانشوروں اور رہنماؤں کو بھی قائل کیا کہ وہ اپنی سرکارِ برطانیہ کو سمجھائیں کہ ہندو مسلم اتحاد کسی صورت ممکن نہیں۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ مسلم علاقوں پر مشتمل ایک علاحدہ ملک دے دیا جائے۔
۲۸ رجنوری ۱۹۳۳ء کو میں نے ایک کتابچہ ''ابھی یا کبھی نہیں'' کے عنوان سے انگریزی میں شائع کیا، جس میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ برصغیر میں ہندو اور مسلم ممالک الگ الگ ہونا ضروری ہیں۔ میں نے یہ کتابچہ ایسے وقت میں شائع کیا تھا جب ہندوستان کی تمام قابلِ ذکر سیاسی شخصیات گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن میں موجود تھیں۔ برطانوی سیاست داں اور اخباری نمائندے بھی وہاں بڑی تعداد میں تھے۔ اس طرح میری یہ تجویز لندن سے ہندوستان تک پھیل گئی، بلکہ عالم گیر شہرت حاصل کر لی۔ اس کتابچے کے ذریعے میں نے واضح کیا تھا کہ ہندو مسلم ممالک کی تقسیم اگر جلد نہ ہوئی تو آنے والا دور بدترین ہوگا۔ دونوں بڑی قومیں ایک دوسرے کی جانی دشمن بن کر قتل و غارت گری پر اُتر آئیں گی۔ یہ کتابچہ وقفے وقفے سے اور اہم موقعوں پر شائع ہوتا رہا۔
ترکی کی عالمی شہرت یافتہ ادیبہ اور دانشور 'خالدہ ادیب خانم' نے میرے بارے میں لکھا تھا:
''مسلمانوں کی آزادی کے سلسلے میں دیوانہ وار مصروف و منہمک رہنے کی وجہ سے اپنی جاری تعلیم کا بھی خیال نہ کیا۔ انھوں نے پاکستان بننے سے پہلے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ قریبی رشتے داروں کے زور دینے کے باجود اپنے عہد پر قائم رہے۔ غلام قوم کو آزادی دلانے کے جذبے نے انھیں شادی کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔''
میں نے آزادیِ وطن کی خاطر اپنی کوششوں کو انگلستان تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اس سلسلے میں جرمنی جا کر ہٹلر سے ملاقات کی۔ میں نے ہٹلر کو برصغیر میں مسلمانوں پر برطانیہ کی ناانصافیوں اور ظلم و ستم سے باخبر کیا اور وہاں کے سیاسی حالات بھی تفصیل سے بیان کیے، جس پر ہٹلر نے مسلمانوں کی آزادی کی خاطر ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہٹلر کے علاوہ فرانس، اٹلی، آسٹریلیا

اور گلف کی آزاد ریاستوں کے حکمرانوں سے بھی ملا۔ سب نے میرے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔

جس طرح مسلم لیگ ہندوستان میں رہ کر آزادی کی تحریک چلا رہی تھی، اسی طرح میں نے ہندوستان سے باہر رہ کر آزادی کی راہیں ہموار کیں۔ وطن کی آزادی کی خاطر میں نے اپنی تمام تر توانائیاں اور ساری خوشیاں نچھاور کر دیں۔ اپنے مستقبل کی فکر نہ کی، شادی تک نہیں کی۔

سوچنے کی بات ہے کہ پاکستان بننے کے بعد میں پاکستان میں کیوں نہیں رہا؟

قائداعظم کے ساتھ رہنے والے کچھ لوگوں نے میرے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، اس لیے قائداعظم نے مجھ سے ملاقات تک نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں تاریخ ساز جلسہ تھا اور میں کراچی میں موجود تھا، لیکن مجھے کسی نے جلسے میں مدعو نہیں کیا۔ حالاں کہ میں جلسے میں شریک ہونے کا سب سے زیادہ حق دار تھا۔ میں دل برداشتہ ہو کر واپس لندن چلا گیا۔

پھر جب اپریل ۱۹۴۸ء میں پاکستان بننے کے بعد پہلی بار یہاں آیا تو اس وقت کی حکومت نے مجھ سے کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ سی آئی ڈی کو میرے پیچھے لگا دیا۔ میں جہاں جاتا، میرا پیچھا کیا جاتا۔ میری حرکات و سکنات کو نوٹ کیا جاتا۔ ان سب باتوں سے میں بہت مایوس ہو گیا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہی مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی گئی، جس کا طریقہ یہ اپنایا گیا کہ کسی بھی جلسے میں، مباحثے میں اور کسی بھی سطح پر میری خدمات کا ذکر تک نہ کیا جاتا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی میرے کارناموں اور جدوجہد کو جان بوجھ کر اُجاگر نہیں کیا گیا۔ آج بھی درسی کتب میں میرا ذکر صرف اتنا آتا ہے کہ میں نے انگلستان میں ایک کتابچہ لکھا تھا اور ایک نام تجویز کیا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود کچھ لوگوں کے زور دینے پر میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے تیاری مکمل کر لی تھی کہ ۲۸ر جنوری کو مجھ پر نمونیے کا شدید حملہ ہوا، جس پر مجھے ایولن نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں میں کئی روز زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا اور آخر ۳ر فروری ۱۹۵۱ء کو تقریباً ۵۵ سال کی عمر پا کر میں نے موت کو گلے لگا لیا۔

جس وطن کی خاطر میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، وہاں مجھے دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔

میری لاش ۱۸ روز تک نرسنگ ہوم کے سرد خانے میں پڑی رہی۔
آخر ۲۱ر فروری کو چند مصری طالب علموں نے میری نمازِ جنازہ پڑھ کر مجھے امانتاً کیمبرج میں ہی دفن کر دیا۔

.....

شمارہ جنوری ۲۰۲۰ء میں عظیم مسلمان طبیب ابنِ سینا (بُو علی سینا) سے آپ کو ملوایا تھا۔ اکثر نونہالوں نے شخصیت کا درست نام بوجھ لیا ہے۔انعام کے لیے قرعہ اندازی کے ذریعے درجِ ذیل تین نونہالوں کے نام نکالے گئے:

۱۔ تہامی رضا، کراچی ۲۔ ملک محمد احسن، راولپنڈی

۳۔ ثانی زہرا، پرانا نواب شاہ

درست نام بوجھنے والے دیگر نونہال

☆ کراچی: محمد معاذ علی خان، سید محمد احمد، ارزہ وسیم انصاری، ماہم مجاہد، آرزجنید، حسان خالد، حسان طاہر، محمد طیب صدیقی، علینا اختر، حُر بن اشعر، حافظہ حورلائبہ خداداد، ایمن شیخ، سید عفان احمد، احتشام الدین، سیدہ ماہم شاہ، میمونہ، شورۃ الزہرہ، علیشبہ محمد سہیل، ہما ساجد خان، فاطمہ توقیر، فرحان طاہر، زینب علی، صارم علی، ہدیٰ ملک، عبیرہ طیب خان ☆ راولپنڈی: ملک شاز راحمد، محمد حسن، مدثر طاہر ☆ لاہور: امتیاز علی ناز، حافظہ عروبہ زاہد، عکرمہ ضیا ☆ حیدرآباد: عمارہ خالد، رملہ فرحان، فلک بنتِ عبدالندیم، مریم بنتِ کاشف، سیدہ علیشہ زیدی، عائشہ ایمن عبداللہ ☆ اوباڑو: شمیر، فلک رانی ☆ پرانا سکھر: محمد حسیب، حدید سلیم ☆ میر پور خاص: محمد بلال عزیز، اسما خان ☆ ڈیرہ غازی خان: رفیق احمد ناز، ارفع زینب ☆ کالا گجراں: محمد سعید ☆ ڈیرہ اسماعیل خان: محمد احتشام ☆ اسلام آباد: زینب عثمان ☆ اوکاڑہ: محمد بریر خلیل ☆ خانیوال: محمد گورش خان ☆ سانگھڑ: تسبیحہ شکیل احمد ☆ جھنگ صدر: سارہ فاطمہ ☆ مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆ تلہ گنگ: ایم حسن عبداللہ ☆ ننکانہ صاحب: محمد حسن قادری ☆ ڈیرہ نواب صاحب: مصباح آصف ☆ جہلم: محمد حسین عارف ☆ چشتیاں: رومی صفدر ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆ خان پور: سعید احمد۔

عجیب وغریب جزیرہ

محمد احمد آصف

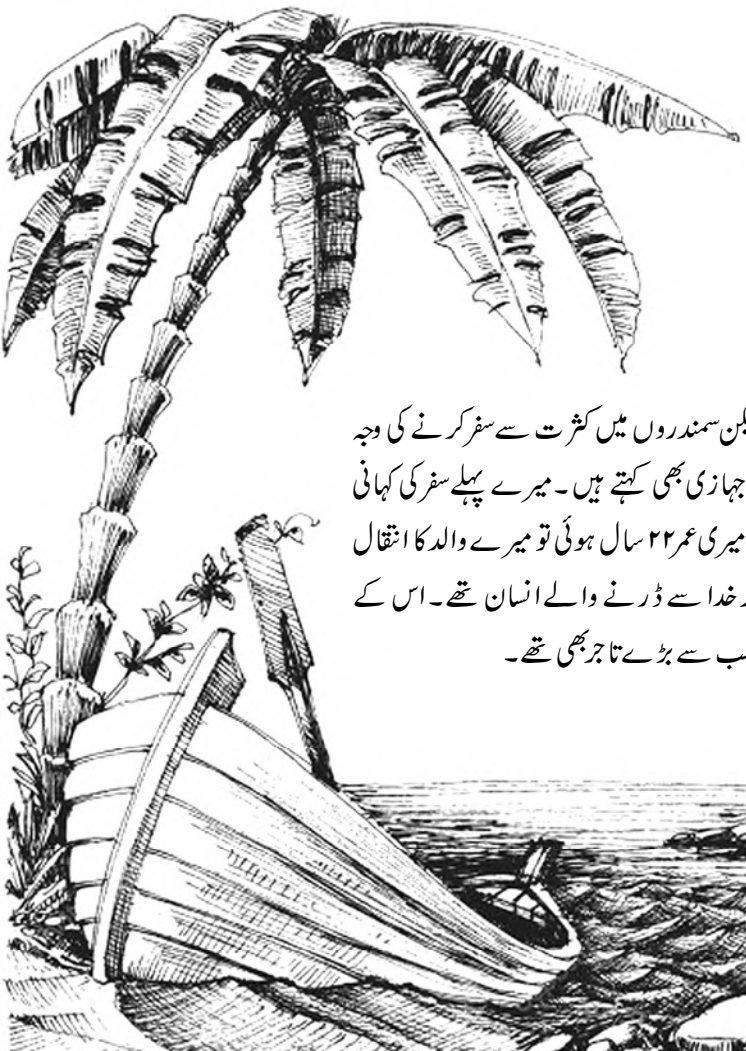

میرا نام سند باد ہے، لیکن سمندروں میں کثرت سے سفر کرنے کی وجہ سے لوگ مجھے سند بار جہازی بھی کہتے ہیں۔ میرے پہلے سفر کی کہانی کچھ یوں ہے کہ جب میری عمر ۲۲ سال ہوئی تو میرے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ نیک اور خدا سے ڈرنے والے انسان تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے شہر کے سب سے بڑے تاجر بھی تھے۔

مجھے میراث کے طور پر بہت سا مال ملا۔ پھر وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے، دولت کی فراوانی کی وجہ سے میں عیش وعشرت میں پڑ گیا۔ صبح دن چڑھے تک سوتا رہتا۔ پھر اُٹھ کر گلاب کے عرق ملے پانی سے غسل کرتا، قیمتی پوشاک پہننا اور پھلوں کا ناشتہ کرتا۔ پھر گانے بجانے کی محفلیں شروع ہو جاتیں۔

میری یہ حالت دیکھ کر بہت سے خوشامدی اور مفت خورے دوست میرے گرد اکھٹے ہو گئے۔ ان کا مقصد دن رات میری تعریفیں کر کے مفت روٹی کھانا تھا۔ میں نے بھی سخاوت کا حق ادا کیا اور دونوں ہاتھوں سے دولت خوب لٹائی۔ رفتہ رفتہ میں امیر سے غریب ہونے لگا۔ جب میرے حالات کم زور ہوئے تو دوست احباب اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ میں ان کی بے وفائی پر حیران رہ گیا۔

پھر ایک دن مجھے خیال آیا کہ یوں اپنی دولت کو ضائع کرنا درست نہیں۔ گھر میں بیٹھ کر کھاؤ تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ سوچا کہ جو دولت باقی رہ گئی ہے، اسے تجارت میں لگانا چاہیے اور جو نفع حاصل ہو اس سے گھر چلانا چاہیے۔ اگلے دن میں نے اپنا مال واسباب بیچا اور دوسرے تاجروں کے ساتھ اپنے شہر کی بندرگاہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہم خلیج فارس کے راستے جزائر مشرق کے قریب سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دورانِ سفر ہم کئی بندرگاہوں پر اُترے پچھلا سامان بیچا اور نیا خریدا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔

ایک دن موسم خوش گوار تھا۔ ہمارا جہاز بڑی تیزی سے سمندر کے سینے کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ہمارے راستے میں ایک چھوٹا سا جزیرہ آ گیا۔ ہمیں معلوم بھی نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ کپتان اس جزیرے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا اور نقشہ نکال کر دیکھنے لگا اور حیرت سے بولا: ''نقشے میں تو اس جگہ کوئی جزیرہ نہیں، معلوم نہیں یہ کہاں سے آ گیا۔ یہ کوئی جادو کا جزیرہ تو نہیں؟'' ہم سب اس کی یہ بات سن کر ہنس پڑے۔

جزیرہ کھیل کے میدان جتنا وسیع تھا اور اس پر نرم نرم زرد رنگ کی گھاس لہرا رہی تھی۔ کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا: ''بادبان کھول دو اور جہاز کو جزیرے کے قریب لے جاؤ۔'' پھر ہم سے مخاطب

ہو کر کہنے لگا: ''تم میں سے جو مسافر بھی مختصر وقت کے لیے جزیرے پر جانا چاہے، اسے میری طرف سے اجازت ہے۔''

ہمارے لیے بڑی غیر متوقع بات تھی۔ ہم بیس کے قریب مسافر جزیرے پر اُترے اور اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے لگے۔ کباب ہمارے پسندیدہ غذا تھی۔ دو چار آدمی جہاز سے لکڑیاں اُتار لائے اور آگ جلانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم بہت خوش تھے اور ایک دوسرے سے خوب مذاق کر رہے تھے۔ ابھی کباب بھوننے شروع کیے تھے کہ جزیرے نے آہستہ آہستہ ہلنا شروع کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جزیرہ اپنی جگہ سے خاصا ہٹ گیا۔ اس کے بعد ہم نے شدید جھٹکا محسوس کیا۔ ہر شخص یہی سمجھا کہ زلزلہ آ رہا ہے۔

اتنے میں جہاز کے کپتان کی آواز آئی: ''جلدی واپس آؤ ورنہ مچھلی پانی میں واپس چلی جائے گی .....جلدی کرو، جلدی۔''

تب ہمیں پتا چلا کہ جسے ہم جزیرہ سمجھ رہے ہیں وہ کوئی بہت بڑی مچھلی تھی جو دھوپ سینکنے کے لیے سمندر کی سطح پر آئی ہوئی تھی۔

مسافروں میں سے جو تیز رفتار تھے وہ تیر کر جہاز پر پہنچ گئے۔ کچھ درمیان میں ڈوبنے لگے اور میں تو ابھی مچھلی کی پُشت پر ہی تھا کہ اتنے میں اس مچھلی نے پانی میں ڈبکی لگانا شروع کر دی۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ مچھلی آہستہ آہستہ نیچے لہروں میں جا رہی تھی اور میرے چاروں طرف پانی بلند ہو رہا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جزیرہ نہیں، بلکہ مچھلی ہے۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ نہ آیا تو میں نے جلدی سے لکڑی کا ایک ٹکڑا پکڑ لیا جو جلانے کی غرض سے جزیرے پر لایا گیا تھا۔ آخری منظر جو میں نے دیکھا یہ تھا کہ ملاحوں کا شور و غل برپا تھا اور جہاز مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اتنی بڑی مچھلی کے پانی میں غوطہ لگانے کی وجہ سے پانی میں بھونچال سا آ گیا۔ سخت گھبراہٹ کا وقت تھا میں نے مضبوطی سے لکڑی کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں کبھی لہروں کے اوپر ہوتا کبھی نیچے۔ چند گھنٹے بعد اندھیرا چھا گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ میرا خوف سے بُرا حال

تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ساری رات کہاں بہتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوگئی اور دور ساحل کی زمین نظر آنے لگی۔ موجیں آہستہ آہستہ مجھے ساحل کی طرف لے گئیں اور میں اوندھے منھ گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ سردی، تھکن اور بھوک سے میری جان نکلی ہوئی تھی۔ منھ میں بھی کچھ پانی چلا گیا تھا۔ کتنی ہی دیر اسی حالت میں لیٹا رہا۔ جب سورج ذرا بلند ہوا تو اس کی شعاعوں سے جسم میں کچھ حرارت پیدا ہوئی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک جزیرہ پھیلا ہوا تھا۔ میں گزشتہ دن والے واقعے سے اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے لگا کہ شاید یہ بھی کوئی مچھلی نہ ہو۔ اسی غرض سے میں نے اپنا قدم چند مرتبہ زور زور سے زمین پر مارا، لیکن وہاں پر گیلی زمین کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نڈھال بھی ہو چکا تھا اور کم زور بھی، لیکن پھر بھی ہمت کر کے کچھ آگے بڑھا اور چند جڑی بوٹیوں سے اپنی بھوک مٹائی۔ جب ذرا جان میں جان آئی تو چل پھر کر جزیرے کا جائزہ لینے لگا۔

جزیرے کے درمیان گھاس کا ایک میدان تھا جہاں چند حبشی، گھوڑے چَرا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے نعرہ لگایا اور دوڑ کر میرے قریب آ گئے۔ یہ چار پانچ لمبے قد کے مضبوط جسموں والے لوگ تھے۔ ان کا رنگ سیاہ اور دانت سفید تھے۔ وہ مجھ سے کسی اجنبی زبان میں بات کرنے لگے۔ پہلے تو میں نے اشاروں سے جواب دینے کی کوشش کی جب ان کی سمجھ میں نہ آئی تنگ آ کر عربی میں کہا: ''تم کون ہو؟''

ایک بوڑھا حبشی آگے بڑھا اور مجھے عربی میں جواب دینے لگا: ''یہی تو ہم تم سے پوچھ رہے ہیں کہ تم کون اور اس جزیرے پر کیسے آئے ہو؟''

میں نے انھیں اپنی ساری کہانی سنا دی۔ وہ میرے ساتھ بڑے احترام سے پیش آئے اور اپنے خیمے میں جا کر کھانا کھلایا۔ پھر کہنے لگے: ''نوجوان! تم دل مضبوط رکھو۔ تم ایک رحم دل بادشاہ کے ملک میں ہو۔ ہم سب اس کے غلام ہیں اور روزانہ یہاں شاہی گھوڑے چَرانے لاتے ہیں۔ ہم تمھیں دربار میں پیش کریں گے۔ بادشاہ تمھیں دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔''

یہ سن کر میری ہمت بڑھی اور پچھلے واقعات کا خوف دور ہوا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ شام کو وہ

مجھے شاہی محل میں لے گئے جو آبادی کے درمیان میں بنا ہوا تھا۔
اگلے دن میں بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے میری کہانی سن کر مجھے تسلی دی اور کہا کہ تم میرے مہمان ہو۔ جب تک چاہو یہاں رہو۔اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ شاہی مہمان کی حیثیت سے میرا مکمل خیال رکھا جائے۔ چناں چہ میں زندگی کے باقی دن وہاں گزارنے لگا۔ ہر وقت مایوس اور غمگین رہنے لگا، کیوں کہ جو کچھ میرے پاس تھا وہ بھی ضائع ہوگیا اور گھر والے بھی چھٹ گئے۔اسی جزیرے پر ایک بندرگاہ تھی جہاں ساری دنیا سے تجارتی جہاز آتے جاتے تھے۔ بندرگاہ اتنی بڑی تھی کہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ہر وقت میلے کا سماں رہتا تھا۔ میں اکثر اوقات وہاں چلا جاتا تھا اور کچھ وقت گزار کر واپس چلا جاتا۔ایک دن میں دوپہر کے وقت وہاں کھڑا تھا کہ ایک جہاز آ کر رُکا۔
ملاحوں نے لنگر ڈال دیا وار تجارتی سامان اُتارنا شروع کر دیا۔تاجر اپنا اپنا سامان وصول کر کے گوداموں میں جانے لگے۔اچانک میری نظر چند گٹھوں پر پڑی جن پر موٹے حروف سے میرا نام لکھا ہوا تھا۔اتنے میں میں نے کپتان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ ملاحوں کو حکم دے رہا تھا: ''سند باد کا سامان اِدھر علاحدہ ایک طرف رکھ دیا اس کا سامان دوسرے سامان میں نہ ملنے پائے۔
میں نے کپتان کی شکل وصورت پر غور کیا تو یاد آیا کہ یہ وہی ہے جس کے ساتھ میں نے سفر شروع کیا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور ابتدائی سلام دعا کے بعد بتایا کہ میں ہی سند باد ہوں جس نے اس کے ساتھ سفر شروع کیا تھا اور ایک جزیرہ نما مچھلی کی وجہ سے اس سے جدا ہوگیا۔ کپتان نے میری بات کا یقین کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ جب مچھلی نے پانی میں غوطہ لگایا تو سند باد ہماری آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا تھا۔
میں نے اس سے بحث کی اور کئی نشانیاں بتائیں۔آخر وہ مطمئن ہوگیا اور میرا سامان میرے حوالے کر دیا۔ میں نے سامان وہیں بندرگاہ کے گودام میں رکھوایا اور شاہی محل کی طرف چل پڑا۔ میرا بس نہ چلتا تھا ورنہ اُڑ کر بادشاہ کے پاس پہنچ جاتا اور اسے بتایا کہ میرا تجارتی سامان اتفاق

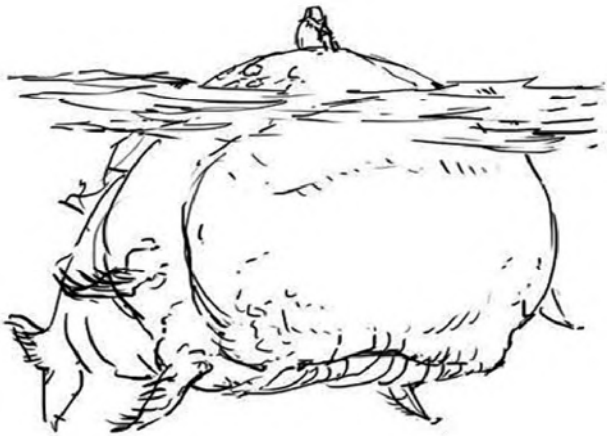

سے دوبارہ مل گیا ہے۔

بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ملی تو وہ بھی خوش ہوا اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں چند دن مزید اس جزیرے پر رکا، پھر بادشاہ سے اجازت لے کر رخصت ہوا۔ اس نے تحفے تحائف دے کر مجھے روانہ کیا۔

اس کے بعد میں راستے میں کئی بندرگاہوں پر اُترا۔ اپنا پرانا مال بیچا اور نیا خریدا۔ ایک طویل مدت کے بعد میں اپنے شہر واپس لوٹا۔ جب گھر پہنچا تو قبیلے والوں نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ایک بہت بڑی ضیافت بھی کی۔

میرے ساتھ تجارتی سامان کے طور پر صندل کی لکڑی، مور اور برگد کے مرتبان، لونگ، دار چینی، گلاب کے عطریات، کافور، سونے چاندی کے زیوارات، ریشم و حریر کے کپڑے اور بہت سے جواہرات تھے۔ یہ سارا سامان ہمارے شہر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مجھے تجارت میں تقریباً ایک لاکھ سونے کے سکون کا نفع ہوا۔

میں نے ایک باغ خریدا اور اس میں ایک عالی شان مکان بنوایا۔ اس طرح آرام و سکون کی زندگی گزارنے لگا۔ جلد ہی میں ماضی کی ساری تکلیفیں اور مصائب بھول گیا اور خوش و خرم رہنے لگا۔

نونہال ادیب

نونہال قلم کاروں کی تحریریں جو اُنہیں آگے چل کر یاد دلائیں گی کہ اُنھوں نے لکھنے کا آغاز کیسے کیا تھا

- عمیمہ صہیب، اسلام آباد
- ایمن شاہد، میر پور خاص
- مُرلی چند، شکار پور
- علشبہ آصف، احمد پور شرقیہ
- محمد ارسلان رضا، کہروڑ پکا
- دعا مصطفیٰ، خیر پور میرس
- محمد شمیر بوسن، راجن پور
- سیدہ مبشرہ، کراچی
- احمد علی، رحیم یار خان

عظیم قائد

عمیمہ صہیب، اسلام آباد

میرا نام قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ میں ۲۵/ دسمبر ۱۸۷۶ء میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام جینا پونجا تھا اور والدہ کا نام مٹھی بائی تھا۔ میں نے کچھ عرصے کرسچن مشن ہائی اسکول میں پھر لندن کی آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ مجھے اپنی ذہانت کی وجہ سے لندن کے مرکزی دفتر میں اپرنٹس شپ کا بھی موقع ملا۔ میری والدہ، میرے انگلینڈ جانے پر راضی نہ تھیں، مگر پھر وہ ایک شرط پر مان گئیں کہ انگلینڈ جانے سے پہلے میری شادی کردی جائے۔

۱۸۹۳ء میں میری شادی ایمی بائی سے کردی گئی۔ اس کے بعد میں انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے اپنی ساری زندگی تعلیم اور محنت کو اہمیت دی۔ برطانیہ سے واپس آنے کے بعد وکالت شروع کردی۔ اس دوران میں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ کانگریس کا حصہ بننے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مسلمانوں کے حقوق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ سب چیزوں کا اختیار غیر مسلموں کے پاس ہے۔ مسلمان ان کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ سب دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد میری سوچ میں انقلاب آیا کہ کیوں نہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ جماعت قائم کی جائے اور ان کے حق کے لیے لڑا جائے۔ میں نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ میں لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو یکسر علیحدہ قومیں ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اور نئے ملک کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ مجھے یہ سب کرتے ہوئے نہایت کٹھن حالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء میں پاکستان جیسا عظیم تحفہ ملا۔ میری آرزو پوری ہوچکی تھی۔ پاکستان بننے کے ایک سال بعد تک میں زندہ رہ سکا اور ۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء میں میں نے وفات پائی۔

شہیدِ ملت

ایمن شاہد، میر پور خاص

قائدِ ملت لیاقت علی خان کا شمار ان عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جو پاکستان کے لیے پیدا ہوئیں، پاکستان کے لیے زندہ رہیں اور پاکستان کے لیے ہی جان قربان کی۔ وہ ملک کے صفِ اول کے رہ نماؤں میں سے تھے اور قائدِ ملت کے نام سے مشہور تھے۔ قائداعظم کے دستِ راست او رآل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری تھے۔

قائدِ ملت کرنال کے نواب خاندان میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب ایران کے مشہور فرمانروا نوشیرواں سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اُتر پردیش میں حاصل کی۔ بی اے علی گڑھ یونی ورسٹی سے کیا اور بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلینڈ کی آکسفورڈ یونی ورسٹی میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وہ فطرتاً خاموش طبع اور محنتی انسان تھے۔ ان کے دل میں قوم کا گہرا درد تھا۔ ظاہر داری اور منافقت سے انھیں نفرت تھی۔

قائداعظم نے ان کی قابلیت کی قدر کرتے ہوئے انھیں اپنا دستِ راست بنالیا۔ ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا تو وہ ملک کے پہلے وزیراعظم بنے۔ یوں ایک نہایت اہم ترین ذمے داری ان کے کاندھوں پر آن پڑی۔ انھوں نے اپنی قابلیت، تدبیر اور سیاسی سوجھ بوجھ کا پورا پورا ثبوت دیا۔ عالمی برادری میں بھی انھوں نے پاکستان کا نام بلند کیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد تو ان پر مزید ذمے داری پڑگئی۔ انھوں نے ہر مشکل کا مقابلہ نہایت مدبرانہ اور تحمل مزاجی سے کیا۔

ان کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر قوم نے انھیں قائدِ ملت کا خطاب دیا۔ ان میں یقینی طور جرأت، مستقل مزاجی اور بہترین انتظامی قابلیت موجود تھی۔ جس سے شب و روز کام لے کر انھوں نے آخری دم تک ملک وملت کی بے غرض خدمت انجام دی۔

انھوں نے امریکا کا دورہ کیا اور وزرائے اعظم کانفرنس میں شامل ہو کر پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کروایا۔ بھارت نے جب پاکستانی سرحدوں پر فوج جمع کی تو آپ نے بھارت کو مکا دکھا کر اپنی قوم کو متحد ہونے کا پیغام دیا۔ وہ مسلمانان عالم کو ایک پلیٹ فارم پر اکھٹا کرنے کے خواہش مند تھے۔

۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو آپ راولپنڈی میں ایک اہم تقریر کرنے والے تھے، آپ نے کھڑے ہوکر صرف یہ کہا تھا کہ میرے پیارے ہم وطنو! کہ سید اکبر نامی ایک شخص نے آپ پر فائرنگ کردی۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے قوم کو ہمیشہ ہمیشہ چھوڑ گئے۔ کسی ملک کو ایسے مخلص اور قابل سیاست دان مشکل سے ملا کرتے ہیں۔ جب آپ زندہ تھے تو قائدِ ملت تھے پھر شہید ہونے کے بعد شہیدِ ملت کہلائے، آپ کو پاکستان سے اس قدر محبت تھی کہ جو شہادت کے وقت بھی آپ کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا:

''خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔''

شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید

مُرلی چند، شکارپور

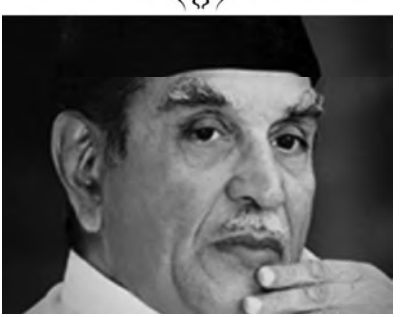

آدمی تو دنیا میں ہر جگہ پیدا ہوتا ہے، لیکن ان میں انسان کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کی پہچان یہ ہے کہ ان میں انسانیت ہوتی ہے اور ان کے گزر جانے کے بعد ان کی یادیں دوسروں کے لیے مثال بن جاتی ہیں۔ ایسے

ہی انمول انسان شہید حکیم محمد سعید تھے۔ اگر ہم ان کی چند خوبیوں کو اپنالیں تو معاشرے میں عزت پاسکتے ہیں۔ شہیدِ پاکستان ایک نیک دل اور حقیقی معنوں میں ہمدرد انسان تھے۔ وہ دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتے تھے۔ وہ ایک ملنسار، سچے، کھرے اور خادم خلق انسان تھے۔ وہ ایک نامور فلاحی خدمت گار انسان کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

انھوں نے خود کو مکمل طور پر مذہبی، غور وفکر کرنے والا عملی انسان بنایا۔ ان کے خیالات میں پختگی تھی۔ ان کا ایک خواب تھا، جوان کے جذبے اور عزم کی وجہ سے باقاعدہ ایک نظام کے تحت آج کئی اداروں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ محنت اور لگن سے لوگ اپنی زندگی کامیاب بنا سکتے ہیں۔ علم ہی انسان کی اخلاقی، تعمیری، رہنمائی کرتا ہے اور جس سے انسانیت وانسانی بھائی چارے کا براہِ راست درس ملتا ہے۔

شہیدِ پاکستان اس دنیا سے جاتے وقت ہمیں انسانیت کا پیغام دے کر گئے کہ ایمان داری کے ساتھ محنت کی جائے اور کسی سے دھوکے بازی نہ کی جائے۔

آیئے شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کی طرح ہم بھی اپنی زندگی میں کوئی ایک ایسا کام کر جائیں کہ فروغِ علم فلاح انسانیت کا یہ سلسلہ زندہ رہے اور آگے بڑھتا رہے۔

نیپچون

علشبہ آصف، احمد پور شرقیہ

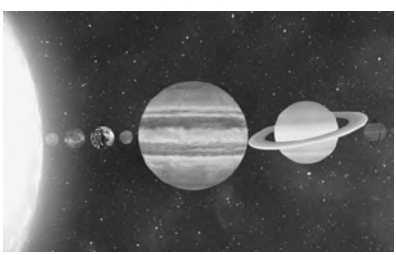

نظامِ شمسی میں زمین سے سب سے دور سیارہ نیپچون ہے۔ نیپچون سیارہ ہماری زمین سے ۱۷ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج کے گرد ایک چکر تقریباً ۱۶۵ برس میں مکمل کرتا ہے۔ یہ سیارے ۱۸۴۶ء میں دیافت کیا گیا تھا۔ اس سیارے کی فضا میں ہائیڈروجن اور ہیلم گیس کی بہتات ہے۔ جبکہ قلیل مقدار میں ہائیڈروکاربن اور نائٹروجن بھی

موجود ہے۔ میتھین گیس بھی بہ کثرت ہے، جس کی وجہ سے یہ سیارہ نیلی رنگت میں دکھائی دیتا ہے۔ زمین کا صرف ایک چاند ہے، جب کہ اس سیارے کے ۱۴ چاند ہیں۔ جن میں سب سے بڑا چاند ٹری ٹون (Triton) کہلاتا ہے۔

ہمارے نظام شمسی میں یہ ساتواں بڑا چاند ہے۔ جسے ۲۳ ستمبر ۱۸۴۶ء کو برطانوی ماہرِ فلکیات نے دریافت کیا تھا۔ یہ چاند نظام شمسی کا واحد چاند ہے جو اپنے سیارے کی گردش کے مخالف مدار میں ہے۔

اچھائی کا انعام

دعا مصطفیٰ، خیر پور میرس

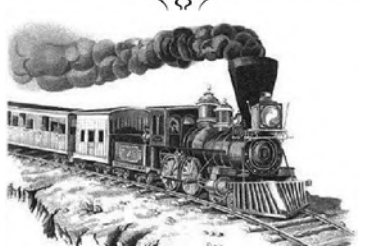

کسی گاؤں میں عباس اپنے ماں باپ اور بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ بہت ہی نیک، سمجھ دار اور ایمان دار لڑکا تھا۔ وہ لوگ بہت ہی غریب تھے۔ عباس اس گاؤں کے چودھری کی زمین پر کام کرتا تھا۔ چودھری بڑا ہی کنجوس تھا۔ وہ عباس کو کام کے بدلے تھوڑے سے پیسے دیتا جس سے ان لوگوں کی گزر بسر بہت مشکل سے ہو پاتی۔

وہ جنوری کی ایک سرد شام تھی۔ عباس کھیت میں اکیلا کام کر رہا تھا۔ سب کسان اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ عباس نے یہ سوچ کر کام بند نہیں کیا کہ چلو تھوڑا کام ہے آج ہی مکمل کرلوں گا۔ تھوڑی دیر بعد سارا کام ختم ہو گیا۔ عباس سامان باندھ رہا تھا کہ دور سے ریل کے آنے کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ عباس نے سوچا کہ چلو آج قریب جا کے ریل دیکھ لیں۔ وہ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ریل کی پٹڑی بیچ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ ابھی ریل کچھ دور تھی اس نے سوچا ریل میں پتا نہیں کتنے مسافر سوار ہوں گے، ان کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ سوچ کر عباس بھاگتا ہوا اوپر چڑھ کر آوازیں دینے لگا:

''ریل کی پٹڑی ٹوٹی ہوئی ہے، ریل کو روکو۔''

ریل کے ڈرائیور نے جب یہ آواز سنی تو جلدی سے ریل کو روک دیا اور باہر آ کر پوچھنے لگا:

''کیا بات ہے لڑکے! ریل کیوں رکوادی؟ تمھیں پتا ہے اس ریل میں وزیرِ اعلا کی والدہ بھی موجود ہیں۔''

ڈرائیور یہ کہہ کر چپ ہوگیا تو عباس نے بتایا:

''ارے چاچا جی! آگے ریل کی پٹڑی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اگر میں وقت پر نہیں بتاتا تو آج ان لوگوں کی جان جاسکتی تھی۔ دیکھیے اس ریل میں کتنے مسافر سفر کررہے ہیں۔''

''مہربانی بیٹا! تم نے ہماری جانیں بچالیں۔''

ڈرائیور چاچا نے کہا۔

''نہیں چاچا یہ تو ہمارا فرض ہے۔''

''اچھا بیٹا! آپ کے والد کا نام کیا ہے؟''

''میرے والد کا نام غلام محمد ہے۔''

اگلے دن عباس کھیت میں کام کررہا تھا کہ اچانک اس کی نظر کالے رنگ کی کار پر پڑی۔ اس کا دروازہ کھلا اور اس میں ایک سوٹ پہنے ایک آدمی اور دو گارڈ کھیتوں کی طرف آنے لگے۔ اس آدمی نے پوچھا: ''یہاں غلام محمد کا بیٹا کام کرتا ہے؟''

''جی میں ہوں غلام محمد کا بیٹا، فرمائیے۔''

عباس نے قریب آکر جواب دیا۔

اس آدمی نے عباس سے کہا: ''تم نے میری ماں سمیت بہت سے انسانوں کی جان بچائی ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو حکومت کی طرف سے ایک اچھا گھر اور ایک بڑی رقم انعام کے طور پر دیا جائے۔ تمھاری تعلیم مفت ہوگی۔ ملک کو تم جیسے ہونہار کی ضرورت ہے۔ چلو ہمیں اپنے والد سے ملواؤ۔''

عباس بہت خوش تھا کہ اللہ پاک نے اس کی اچھائی کا بہترین صلہ دیا۔

خوش گوار زندگی

محمد شمیر بوسن، مہرے والا

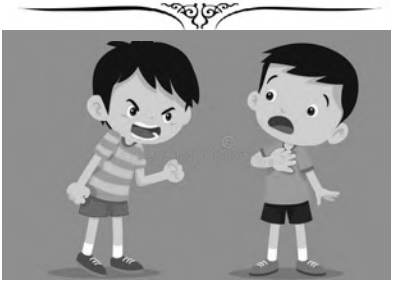

ہم اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ ہمارے دین میں واضح حکم ہے کہ ہم تین دن سے زیادہ کسی کے ساتھ ناراض نہ رہیں، بلکہ صلح میں پہل کریں۔ رشتے بہت عظیم

ہوتے ہیں ان کی پاسداری اور تعظیم کریں۔
نوک جھوک زندگی کا حسن ہے۔ اختلافات، ناراضی، غصہ انسان کی ذات کا حصہ ہیں، مگر کسی انسان کو بُرا سمجھنا، مذاق اُڑانا، اپنے سے کم تر سمجھ کر بے عزتی کرنا، بڑا پن نہیں ہے۔ دوسروں سے توقع رکھنے کے بجائے ان کی توقع پر پورے اُترو۔ حق مانگنے سے پہلے اپنا فرض ادا کرو۔ زندگی آسان ہو جائے گی۔ دوسروں سے شکایت کرنے کے بجائے خود اپنے رویے پر غور کرو۔ اسی کو اپنے گریبان میں جھانکنا کہتے ہیں۔ خود احتسابی عمل سے گزریں تو احساس ہوتا ہے کہ کوتاہی اپنی بھی ہے۔ ایک اچھے عمل سے تمام رکاوٹیں دور ہوسکتی ہیں۔ معمولی باتوں کو وجہ بنا کر ہم اپنی زندگی کو خراب کرتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ مکمل اور دل پسند نہیں ہوتا ہے اور نہ انسان کو وہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے جن کی وہ تمنا کرتا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہی بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ ہر انسان کی ذات، خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ عادت اور فطرت پر پیدا فرمایا ہے۔ کسی انسان کے فائدے کے لیے خود نقصان اُٹھالینا ایثار کہلاتا ہے۔ ہر انسان میں زندگی کی اس کسوٹی پر پورا اُترنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ۔ تم اگر کسی سے ناراض ہو تو معافی مانگنے میں پہل کرو۔ اگر دوسرے کی غلطی ہے تو دل کو صاف کر کے معاف کردو۔ پیار محبت سے آپس میں مل کر خوش گوار زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

شیر کی بادشاہت

سیدہ مبشرہ، کراچی

ایک جنگل میں ہاتھی کی حکومت تھی جو بظاہر بہت طاقت ور دکھائی دیتا تھا، لیکن دن بھر تالاب کے کنارے سُست بیٹھا رہتا اور اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزار دیتا۔ جنگل

بہت وسیع و خوب صورت تھا، اسی وجہ سے دوسرے جنگل کے جانوروں کی نظر پر تھی۔دشمن پہلے بھی ایک دفعہ حملہ کر چکا تھا، لیکن شیر کے گروہ نے دشمنوں کو مار بھگایا۔

ہاتھیوں کی لاپرواہی دیکھتے ہوئے دشمن ایک بار پھر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ہاتھی اس بات سے بالکل بے خبر تھے،لیکن شیروں کو اس بات کی خبر جلد ہی ہوگئی اور شیروں نے خفیہ طور پر مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں اور رات کو جاگ کر پہرا دینے لگے۔

شیر نے ایک دن ہاتھی اور تمام جانوروں کو اِکھٹا کیا اور خطرے سے آگاہ کیا۔ یہ بات ہاتھی کو بُری لگی،لیکن اس نے اپنا غصہ ضبط کرلیا کہ آخر شیر کہنا کیا چاہ رہا ہے۔شیر نے کہا کہ پڑوسی جنگل کے جانور کسی بھی وقت ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہاتھی زور سے قہقہہ لگانے لگے۔ان کی دیکھا دیکھی گینڈے بھی ہنسنے لگے کہ بھلا ہم اتنے بڑے اور طاقت ور ہیں اور وہ معمولی جانور بھلا کیسے ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ہرن ، بندر،خرگوش وغیرہ اپنے بچوں کی طرف سے پریشان ہوگئے اور شیر کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ سب جانوروں کی حفاظت بادشاہ کی ذمے داری ہے، مگر ہاتھیوں نے یہ بات سنی اَن سنی کردی۔شیر کی باتوں میں سچائی تھی اور یہ سچائی ایک دن ہاتھیوں اور گینڈوں پر واضح ہوگئی۔

ایک رات دشمن جانور حملہ آور ہوگئے۔ دور سے دشمن کے قدموں کی آہٹ سن کر شیر خود بھی چوکنا ہوگئے اور دوسرے جانوروں کو بھی جگا دیا، تاکہ وہ اپنی حفاظت کرسکیں،لیکن ہاتھی اور گینڈے نیند کے مزے لے رہے تھے۔پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دشمنوں نے سوئے ہوئے ہاتھیوں اور گینڈوں کو اپنا نشانہ بنایا، لیکن عین اسی وقت شیروں نے دشمنوں پر اس طرح حملہ کیا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لڑائی کافی دیر تک ہوئی۔

صبح ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔صبح کی روشنی میں دشمن جانوروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہاتھیوں اور گینڈوں کی خاصی تعداد ہلاک ہوگئی۔ اب ہر طرف امن کی فضا تھی۔ سب جانوروں کے مشورے سے ایک عقل مند اور ذہین شیر کو بادشاہ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

بڑوں کا ادب

احمد علی، رحیم یار خان

قاسم ایک بہت ہی ذہین بچہ تھا۔ وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ کلاس کے ذہین ترین طلبہ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ قاسم کو اللہ تعالیٰ نے ذہن تو اچھا دیا تھا، لیکن وہ بڑوں کا ادب نہیں کرتا تھا۔ اساتذہ کرام کی نقل اُتارنا، چوری چھپے ان پر جملے کسنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

وقت گزرتا گیا اس نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اسی سلسلے میں اس نے ایک ہوٹل میں دوستوں کو پارٹی دی۔ وہ پارٹی میں شرکت کے لیے اپنی موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار نے اسے ٹکر ماری۔ کار ڈرائیور تو وہاں سے رفو چکر ہوگیا، البتہ قاسم وہیں کراہتا رہا۔ کچھ لوگوں نے انسانی ہمدردی کے تحت اسے اسپتال پہنچایا۔ وہاں پر اس کے گھر والوں کو بلایا گیا۔ کافی خون بہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت اور کم زوری طاری تھی۔ اس کی ٹانگوں پر کافی زخم آئے تھے۔ نتیجتاً اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دی گئی۔

کافی عرصے تک وہ بستر سے لگا رہا۔ اس کے دوست عیادت کے لیے اس کے پاس آئے۔ رفتہ رفتہ وہ بے ساکھیوں کے سہارے چلنے کے قابل ہوا تو اب اس نے پڑھائی کو خیر آباد کہہ کر نوکری کی تلاش شروع کی، لیکن ایک ٹانگ سے معذور شخص کو کیا نوکری مل سکتی تھی۔

آخر اسے ایک اسکول میں معمولی اسکول ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ جب وہ لنگڑا کر کلاس میں داخل ہوتا تو چند شریر بچے اس کی نقل اُتارتے اور جب وہ ان کی طرف دیکھتا تو وہ معصوم بن جاتے۔ ان بچوں کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آجاتا.....اور سوچتا کہ کاش! میں اپنے اساتذہ کرام کا ادب کرتا تو شاید مجھے یہ دن ہی نہ دیکھنے پڑتے۔ اب صرف وہ تھا یا اس کا بیمار، لاچار اور معذور بدن یا پھر اس کا پچھتاوا۔

مغل بادشاہ شاہ جہاں

محمد ارسلان رضا، کہروڑ پکا

مشہور مغل بادشاہ شہاب الدین شاہ جہاں دین اسلام سے بے حد محبت کرتا تھا۔اس کے علاوہ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنانے کے لیے بھی مشہور ہے۔۵رجنوری ۱۵۹۲ء کو پیدا ہونے والا شاہجہاں کے دادا اکبر بادشاہ ابھی زندہ تھے اور اپنے پوتے سے بے حد پیار کرتے تھے۔شاہ جہاں نے علوم اور فنون سپہ گری کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شہزادوں کی طرح عیش و عشرت کا دلدادہ نہ تھا، بلکہ نیک کردار کا مالک تھا۔

اپریل ۱۶۱۲ء میں ارجمند بیگم سے شادی ہوئی۔ تخت نشین ہوتے ہی شاہ جہاں نے فلاحی قوانین نافذ کیے۔اُن کے دور میں دکن اور گجرات میں قحط پڑا تو لاکھوں روپے لوگوں کی امداد پر صرف کیے۔سلطنت کی توسیع اور حسن انتظام پر خاص توجہ کی۔شاہ جہاں نے ''تختِ طاؤس'' بنوایا جس کی تیاری میں لعل ہیرے، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر اور بے شمار سونا استعمال ہوا۔اس تخت کی تیاری میں سات سال کا عرصہ اور تقریباً ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔قلعہ آگرہ میں آٹھ پہلو والا برج اور مسجد بنوائی۔ دہلی کا لال قلعہ، نئی شہر پناہ اور جامع مسجد اسی کی بنائی ہوئی ہے جو عظمت اور خوب صورتی کے اعتبار سے ملک بھر میں بے نظیر ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزاروں پر شان دار گنبد بنوائے اور سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ممتاز محل کا مقبرہ ''تاج محل'' آگرہ میں تعمیر کرایا، جسے بیس ہزار مزدوروں نے ۱۸ سال کے عرصے میں مکمل کیا اور اس پر تین کروڑ روپے صرف ہوئے۔

یہ عمارت اپنے حسن و جمال اور اپنی عظمت کے اعتبار سے دنیا بھر کی عمارتوں میں بے نظیر ہے۔ شاہ جہاں نے اپنی مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے تمام انتظامات بہترین بنیادوں پر قائم کیے تھے۔عالموں، شاعروں اور مصوروں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ شاہ جہاں نے ۲۳ر جنوری ۱۶۶۶ء کو ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

آدھی ملاقات

شاملِ اشاعت بیشتر خطوط ہمدرد نونہال جنوری ۲۰۲۰ء سے متعلق ہیں

نونہال کا انداز کافی بدل گیا ہے۔ پہلے پہلے تو پرانا انداز یاد آیا، مگر یہ بھی اچھا لگتا ہے۔ قائداعظم کے حوالے سے واقعات پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ انکل سلیم مغل پہلی بات خوب لکھتے ہیں۔ شکریہ، گربہ کشتن، روزِ اول، آخری انسان، شہیدِ پاکستان کے اقوال، اور آزاد پرندہ اچھی تحریریں ہیں۔ بلاعنوان زبردست کہانی تھی۔ پورا رسالہ شہیدِ پاکستان کی یادوں سے بھرپور تھا۔

عفت سراج، ڈی جی خان

جنوری کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ انکل! نام بوجھیے میں شخصیت تھوڑی آسان دیا کریں۔ شین شرارت میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ لنچ باکس بہت مزے دار تھا۔ نونہال ادیب کی کہانیاں اچھی تھیں۔

ارفع زینب چشتی، ڈی جی خان

آپ رفتہ رفتہ اپنا مطالعہ وسیع کیجیے۔ شخصیت کا نام بوجھنا خود ہی آسان ہو جائے گا۔

جنوری کا شمارہ بہت بھلا لگا۔ سرورق پر عظیم شخصیت کی پیاری تصویر بہت اچھی لگی۔ عظیم قائد کے بارے میں پڑھ کر فخر ہوا۔ کتنے عظیم تھے ہمارے قائد۔ حکیم محمد سعید شہید کے قول پر مبنی تحریر بہت اچھی لگی۔ عائشہ تنویر کی تحریر ''وہ ایک مکان'' لاجواب تھی۔ بلاعنوان کہانی اس بار خاص نہیں تھی۔ نونہال خبرنامہ بہت دل چسپ سلسلہ ہے۔

حافظ نعمان احمد، ڈیرہ اسماعیل خان

نئے سال کا پہلا شمارہ بہت ہی زیادہ اچھا تھا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ شین شرارت پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

نرین بانو سلیم الدین عباسی، حیدرآباد

ہمدرد نونہال ہمیشہ کی طرح اب بھی نونہالوں کی اُمیدوں پر پورا اُتر رہا ہے۔

محمد حسیب، سکھر

شکریہ اور ایثار کا پیکر بہت سبق آموز کہانیاں ہیں۔ سفرنامہ اچھا جا رہا ہے۔ آزاد پرندہ اور وہ ایک مکان اچھی کہانیاں تھیں۔ بلاعنوان کہانی بھی ٹھیک تھی۔ نونہال ادیب اور علم دریچے میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اس بار بھی پسند آئے۔ ٹماٹر اور بھن بھن پن پن اچھی نظمیں تھیں۔ شین شرارت اور نونہال مشاعرہ اچھے سلسلے ہیں انھیں جاری رکھیے۔ نونہال خبرنامے سے دیس دیس کی نت نئی خبریں پڑھنے کو ملیں۔ نونہال لغت سے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا۔

آمنہ شیریں چشتی، ڈیرہ غازی خان

ہمدرد نونہال میرا اور میرے گھر والوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ دل چسپ اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے میرے ابو امی اور بہن بھائی نونہال شوق سے پڑھتے ہیں، گویا ہمدرد نونہال بچے بڑے اور بوڑھے سب کا منفرد رسالہ ہے۔

عمار خالد اختر، حیدر آباد

ہر بار کی طرح جنوری کا شمارہ بھی زبردست تھا۔ یعنی نئے سال کا سب سے بہترین تحفہ جنوری کا شمارہ تھا۔ شکریہ، وہ ایک مکان اور ایثار کا پیکر سمیت تمام کہانیاں نمبر ون تھیں۔ آخری انسان کچھ خاص نہ تھی۔ شین شرارت کے لطیفے بہت مزے دار تھے۔ ان شاء اللہ ہمدرد نونہال بہت ترقی کرے گا۔

محمد معاذ حفیظ، راولپنڈی

ہمدرد نونہال کا ہر شمارہ سپر ہٹ ہوتا ہے۔ معلومات، مضامین اور کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ جاگو جگاؤ سے واقعی انسان جاگ اُٹھتا ہے۔ پہلی بات دل کو لگی۔ بلاعنوان انعامی کہانی ، آزاد پرندہ (جاوید اقبال)، وہ ایک مکان اور بچوں کے بھوت اچھی تحریریں ہیں۔ شین شرارت پڑھ کر ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ نونہال میں تصویروں کی تبدیلی بہت ہی زیادہ بُری لگی۔

علی احمد، رحیم یار خان

جنوری کا شمارہ اچھا لگا۔ ساری کہانیاں بہت ہی اچھی تھیں۔ آخری انسان، نے سوچنے پر مجبور کیا۔ شکریہ کہانی تو بہت ہی اچھی لگی۔ بلاعنوان کہانی بھی اچھی لگی۔ علم دریچے، شین شرارت غرض سارا رسالہ بہت ہی اچھا لگا۔ سرورق تو بہت زیادہ پسند آیا۔

اُمِ ایہا شکیل احمد منصوری، سانگھڑ

جاگو جگاؤ میں ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت پیغام تھا۔ پہلی بات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ حکیم سعید واقعی عظیم انسان تھے۔ روشن خیالات نے خیالات روشن کر دیے۔ عظیم قائد سے پتا چلا کہ بڑے لوگ واقعی بڑے کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ کہانیوں میں تمام کہانیاں ہی ٹاپ تھیں۔ شین شرارت بھی اچھی لگی۔ نونہال مشاعرہ تو زبردست تھا۔ علم دریچے اور نونہال ادیب بھی اچھے لگے۔ نام بوجھیے بہت آسان تھا۔ پورا شمارہ بہترین تھا۔ انکل! کوپن پر پتا لکھنے کا صحیح طریقہ بتا دیں۔ وارڈ، بلاک، ہاؤس، نزد، شہر سب کچھ کوپن پر کیسے آ سکتا ہے؟

تسبیحہ شکیل احمد، سانگھڑ

کوپن آپ جس بڑے کاغذ پر چسپاں کریں، اس پر بھی نام پتا واضح کر کے لکھ دیا کریں۔

جنوری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ اپنی پہلی تحریر دیکھ کر بہت بہت خوشی ہوئی۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح تمام کہانیاں سپر ہٹ تھیں۔ شین شرارت، نونہال مشاعرہ، علم دریچے اور نونہال خبر نامہ بہت ہی عمدہ تھے۔ نظمیں تو اچھی ہوتی ہی ہیں۔ سلیم مغل کا سفر نامہ بھی اچھا چل رہا ہے۔

اسماء خان، میر پور خاص

جنوری کا شمارہ سپر ہٹ تھا۔ جاگو جگاؤ بہت سبق آموز تھا۔ روشن خیالات سونے سے لکھنے کے قابل تھے۔ کہانی ''شکریہ'' اچھی تھی۔اس کے علاوہ آخری انسان، ایثار کا پیکر، آزاد پرندہ اور وہ ایک مکان بھی اچھی کہانیاں تھیں۔نونہال ادیب میں اریبہ ارم اعوان کی کہانی پسند آئی۔

سدرہ نور چشتی، ڈیرہ غازی خان

سالِ نو کا پہلا شمارہ دلوں کو بھا گیا۔ مہینے کا پیغام لاجواب تھا۔بچوں کے بھوت مزے دار اور میری پسند کے عین مطابق تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔اس کے علاوہ وہ ایک مکان، ایثار کا پیکر، آزاد پرندہ، گربہ کشتن، روز اول بہترین اور دل چسپ تھیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔اس بار کا شمارہ بہترین کہانیاں اور بے انتہا مزے دار، خوب صورت اور مزاحیہ نظمیں لیے ہوئے تھا۔علم دریچے اور نونہال ادیب کے تو کیا ہی کہنے تمام نونہالوں کی محنت لاجواب ہے۔ اشاعت سے معذرت کا صفحہ بھی شائع کیا کریں۔نونہال بک کلب ممبرشپ کب تک ملے گی؟

سیدہ ماہم شاہ، کراچی

کتابوں کی تفصیل فروری کے شمارے میں شائع ہوچکی ہے۔

میں بہت عرصے سے ہمدرد نونہال پڑھ رہا ہوں۔ ماشاء اللہ رسالے کا معیار اب وہ نہیں رہا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ لطیفے بہت کم کردیے ہیں۔اس کے علاوہ غیر ضروری چیزیں بہت زیادہ ہیں جو پورا پورا صفحہ گھیر لیتی ہیں اشعار کے لیے ایک مکمل صفحہ ہوا کرتا تھا جواب بھی ہے، مگر شعر کم نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ اچھی تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں جیسے کہ ''میسج آف منتھ'' اور خطوط کی تعداد میں اضافہ اور نونہال ادیب والی کہانیوں میں اضافہ اس رسالے سے ایک گہرا تعلق ہے اس لیے باوجود قیمت میں حد درجہ اضافے کے بھی خریدنا پڑتا ہے۔کہانیوں کا معیار پہلے سے کم، مگر دوسرے رسالوں سے بہتر ہے اس ماہ کا رسالہ اچھا تھا۔

گورش خان، خانیوال

ہمدرد نونہال علم کا ایک ذخیرہ ہے، لیکن جو تبدیلی تصاویر میں کی گئی ہے وہ کچھ خاص اچھی نہیں لگی، اگر ممکن ہو تو اس کمی کو پورا کردیں۔ بلاعنوان انعامی کہانی اور محنت کا جادو کہانی بہت پسند آئی۔ مجھے نونہال خبرنامہ بہت پسند ہے۔ ہمدرد نونہال ہمارا بہترین ساتھی ہے۔

اریبہ ارم اعوان، مظفر گڑھ

اس بار بھی نونہال بے حد شان دار تھا۔ سرورق پر جناب حکیم محمد سعید کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا اللہ پاک ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، وہ بہترین انسان تھے۔۹ رجنوری ۲۰۲۰ کو حکیم صاحب کا صد سالہ جشنِ ولادت مبارک ہو۔

زنیرہ بن اشعر، رباب فاطمہ، حُر بن اشعر، کراچی

مضمون قائداعظم کی خوش مزاجی سے قائداعظم کی

خوش مزاجی کا پتا چلا۔ روشن خیالات میں سبھی خیالات حکمت سے بھرے ہوئے تھے۔ ہیرا پھیری اور قائداعظم کے مشغلے اس شمارے کی سب سے بہترین تحریریں ہیں۔ کہانی پانچ لاکھ بہت اچھا سبق دے رہی ہے۔علم دریچے نے علم میں اضافہ کیا۔ شین شرارت بہت پسند آیا۔

عزیر اسلم، حسن اسلم، کراچی

کہانیوں میں افواہ سازی اور ہیرا پھیری مجھے بہت پسند آئی۔ شین شرارت ہمیشہ کی طرح بہت مزاحیہ تھا۔ روشن خیال سے وہ باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں جو بہتر انسان بننے کے لیے بہت ضروری ہیں۔

زہرہ کنول اعوان، مظفر گڑھ

جنوری کا شمارہ بہت ہی اعلا تھا۔ سرورق پر حکیم محمد سعید کے قول نے بہت متاثر کیا کہ میں اپنی آن پر وعدہ کرتا ہوں۔'' خدا توفیق دے جس کو'' بہت اچھی نظم تھی۔ ''عظیم قائد'' واقعی ایک دل چسپ واقعہ تھا۔ ''ٹماٹر'' ایک مزاحیہ نظم تھی، اچھی لگی۔ ''شین شرارت'' پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ سفرنامہ امریکا بہت اچھا جارہا ہے۔ سلیم مغل انکل نے صحیح کہا تھا کہ یہ ہماری ہی حرکتیں ہیں جس کی وجہ سے ہم دنیا سے پیچھے ہیں۔ کوا بے چارہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ سب سے بہترین کہانی آزاد پرندہ تھی۔ وہ ایک مکان بھی اچھی کہانی تھی۔ نونہال ادیب میں بغل میں بچہ (محمد اعجاز) پسند آئی۔ جنوری کے شمارے نے دل جیت لیا۔

رمشاء معین الدین، کراچی

پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں، لیکن نونہال کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شمارہ دل چسپ رہا۔ دو، تین مہینوں سے لطیفہ بھیج رہی ہوں اور وہ مزاحیہ بھی ہوتے ہیں، مگر شائع نہیں ہوتے، ایسا کیوں؟

انعم اقبال احمد، نارتھ کراچی

تمام لطیفے نونہال ہی بھیجتے ہیں۔ جو زیادہ پسند کیے جاتے ہیں، انھیں شامل کرلیا جاتا ہے۔

سلیم کوثر کی نظم خدا توفیق دے بہت اچھی تھی۔ حکیم محمد سعید کی خوب صورت اور یاد رکھنے والی باتیں اور سلیم مغل کا سبق کا آموز واقعہ پہلی بات میں پڑھنے کو ملا۔ بہت ہی زبردست تھا۔ تلوک چند محروم کی نظم جھوٹ اچھی تھی۔ پھر تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سب ہی اپنی مثال آپ تھی۔ شین شرارت نے تو ہنسنے پر مجبور کردیا اور نونہالوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ سب اچھی تھیں۔ نونہال ادیب میں بھی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ نونہال لغت سے بہت سارے نئے الفاظ سیکھنے کو ملے۔ ہمدرد نونہال کے ہر شمارے میں کافی محنت کی جاتی ہے اور اسی محنت کی وجہ سے ہر شمارہ بہت عمدہ ہوتا ہے۔

حمنہ محمد عقیل شاہ، لیاری کراچی

سلیم کوثر کی نظم خدا توفیق دے بہت ہی خوب صورت اور اچھی تھی۔ جاگو جگاؤ میں حکیم صاحب کا پیغام بہت ہی خوب تھا۔ سلیم مغل کی پہلی بات پڑھ کر سعدیہ آپا کی شخصیت میں حکیم صاحب کی کردار کی سر بلندی نظر آئی۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، روشن خیالات بہت عمدہ تھے۔ قائداعظم کی زندگی کا دل چسپ واقعہ بہت زبردست رہا۔ تمام نظمیں بہت اچھی تھیں۔ نذیر انبالوی کی تحریر شکریہ اچھی کہانی تھی۔ بچوں کا بھوت پڑھ کر کچھ عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ لائق نالائق پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ انسان محنت کرے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ تفسیر حیدر تفسیر کی تحریر آخری انسان بہت زبردست کہانی تھی، بہت اچھا پیغام ملا۔ نونہال سیرت کانفرنس کی اور حکیم محمد سعید کی رنگین تصاویر بہت اچھی اور خوبصورت تھی۔ شین شرارت پڑھ کر تھکے ہوئے دماغ کو سکون ملا۔ شریر تصاویر دیکھ کر تو آنکھیں بھی مسکرا دیں۔ سلیم مغل صاحب کا سفر نامہ امریکا بس بھئی بہت ہوگیا بور ہوگئے ہم۔ کہانی ''گربہ کشتن روزِ اول'' میں معصوم بلی بے چاری پر تو بہت ظلم ہوگیا۔ تحریر ایثار کا پیکر اس ماہ کی سپر ہٹ کہانی تھی۔ راؤ جی کی تحریر شہیدِ پاکستان اپنے اقوال کی روشنی میں پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ جاوید اقبال کی تحریر آزاد پرندہ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اپنا گھر سب سے پیارا ہوتا ہے۔ نونہال مشاعرہ میں بچوں نے اچھے اشعار کا انتخاب کیا۔ نونہال خبر نامہ میں خرم فرخی نے بہت زبردست خبریں جمع کی ہیں۔ نونہال مصور میں بچوں کی تمام تصاویر بہت زبردست تھیں۔ عائشہ تنویر کی تحریر وہ ایک مکان اچھی سوچ تھی۔ نیا سال مبارک ہو غلام حسین میمن کی بہت اچھی تحریر تھی۔ بلاعنوان انعامی کہانی بہت زبردست لگی۔ نام بوجھیے سلیم فرخی کی تحریر بہت اچھی اور معلوماتی ہوتی ہے۔ نونہال ادیب میں بچوں نے بہت اچھی اور سبق آموز کہانیاں لکھی تھیں، پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

اُمِ ایمن محمد عقیل شاہ، لیاری، کراچی

سب سے پہلے ۹ رجنوری کے حوالے سے نونہال کے عظیم محسن حکیم محمد سعید کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں۔ ۲۰۲۰ کا شمارہ اول بھی سابقہ شماروں کی طرح زبردست تھا۔ جاگو جگاؤ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہر مشکل وقت میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ سلیم مغل کی پہلی بات میں ان کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھنے کو ملا۔ کلیم چغتائی کی نظم ٹماٹر اور تلوک چند محروم کی نظم جھوٹ زبردست تھیں۔ پھر شین شرارت نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ نام بوجھیے پڑھا، لیکن نام نہ آنے پر تھوڑی سی مایوس ہوگئی۔ کہانیوں میں عائشہ تنویر کی کہانی وہ ایک مکان اور ڈاکٹر توصیف تبسم کی کہانی گربہ کشتن، روزِ اول دل کو چھو جانے والی کہانیاں تھیں۔ غرض سرورق سے لے کر نونہال لغت تک پورا نونہال اپنی مثال آپ تھا۔

رقیہ محمد عقیل شاہ، لیاری، کراچی

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال جنوری ۲۰۲۰ء کے شمارے میں محترمہ فریحہ ابتسام کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔ نونہالوں نے بہت اچھے اچھے عنوانات بھیجے۔ کمیٹی نے خوب غور کرنے کے بعد تین اچھے عنوانات کا انتخاب کیا ہے، جو تین نونہالوں نے مختلف جگہوں سے ارسال کیا ہے:

۱۔ اللہ کی پکڑ : عائشہ اشرف صدیقی، کراچی

۲۔ بے آواز لاٹھی : سعد عثمان طارق، اسلام آباد

۳۔ مکافاتِ عمل : اسما خان، میر پور خاص

﴿ چند اور اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں ﴾

ضمیر کی عدالت۔ سچی توبہ۔ صراطِ مستقیم۔ ضمیر کی آواز۔

صبح کا بھولا۔ زرد فائل۔ سچ کی جیت۔ خیر و شر۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں دل چسپ عنوانات بھیجے

☆ کراچی: آمنہ بخاور، خنسہ محمد عقیل شاہ، شایان احمد، محمد اشبل عاصم خان، سیدہ اریبہ غفران، ردا حمید، لبنیٰ خان، ناعمہ تحریم، علینا اختر، صارم علی، سیدہ زینب علی، فرحان طاہر، حسان طاہر، ہما ساجد خان، عائشہ اشرف صدیقی، سید عفان احمد، حسان خالد، وایا جنید، ماریہ مجاہد، ارزہ محمد وسیم انصاری، سیدہ فاطمہ شعیب، تہامی رضا، احتشام الدین، سیدہ ماہم شاہ، علیشبہ محمد سہیل، شورۃ الزہرہ،

مصباح شاہ، ہدیٰ فلک، عبیرہ طیب خان☆اسلام آباد: لائبہ امان ☆ڈیرہ غازی خان: عفت سراج، ارفع زینب، رفیق احمد ناز☆راولپنڈی: ملک شاز راحمد، ملک محمد احسن، زہرا نور بٹ ☆حیدرآباد: سید محمد حسین شاہ، رملہ فرحان، عمار خالد، نرین بانو سلیم الدین، سیدہ علیشہ زیدی، عائشہ ایمن عبداللہ☆سکھر: محمد حسیب، حدید سلیم قریشی، ☆ڈیرہ اسماعیل خان: محمد احتشام سواگ ☆پرانا نواب شاہ: ثانی زہرا☆لاہور: امتیاز علی ناز☆جھنگ صدر: محمد طیب☆تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ڈیرہ نواب صاحب: مصباح آصف☆جہلم: محمد حسین عارف ☆ننکانہ صاحب: محمد حسن قادری ☆مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆میر پور: محمد مزمل احمد☆اٹھارہ ہزاری: عاقب فرید گھلو☆ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆واہ کینٹ: ہادیہ خان ☆اوکاڑہ: محمد بریر خلیل راؤ☆فیصل آباد: بریرہ فاطمہ☆خانیوال: محمد گورش خان ☆سانگھڑ: اُمِ ابیہا شکیل احمد منصوری۔

تصویر میں چار الفاظ پوشیدہ ہیں۔ اگر ایک منٹ میں تلاش کرلیا تو آپ ذہین۔

نونہال لغت

احتساب	اِ حْ تِ سَا ب	باز پُرس۔ جائزہ۔ روک ٹوک۔ ممانعت۔	
دستِ راست	دَسْ تے رَا سْ ت	دایاں ہاتھ۔ حامی۔ مددگار۔	
اثبات	اِ ثْ بَا ت	اقرار (انکار کی ضد)۔ ثبوت۔ وجود یا موجود ہونا۔	
خستہ حال	خَ سْ تَہ حَا ل	شکستہ دل۔ پریشان۔ رنجیدہ۔ ناخوش۔	
مامور	مَا مُو ر	مقرر۔ معین۔ اجازت کیا گیا۔	
معمور	مَ عْ مُو ر	بھرا ہوا۔ لبریز۔ بسا ہوا۔	
خبط	خَ بْ ط	سودا۔ دیوانگی۔ جنون۔	
خلقت	خَ لْ قَ ت	مخلوق۔ لوگ۔	
ملحق	مُ لْ حَ ق	جڑا ہوا۔ ملا ہوا۔ لگا ہوا۔ منسلک۔	
مدبر	مُ دَ بْ بِ ر	تدبیر کرنے والا۔ عقل مند۔ دانش مند۔	
تلاطم	تَ لَا طُ م	موجوں کا زور۔ پانی کے تھپیڑے۔ موج۔ لہر۔ جوش۔	
بے محابا	بے مُ حَا بَا	بے دھڑک۔ بے تکلف۔ بے حجاب۔	
سماوی	سَ مَا وِ ی	آسمانی۔ غیبی۔	
حاوی	حَا وِ ی	گھیرنے والا۔ احاطہ کرنے والا۔ چھا جانے والا۔	
خطیر	خَ طِی ر	بڑا۔ کثیر۔ بہت۔	
معاش	مَ عَا ش	رزق۔ خوراک۔ وہ شے جس سے بسر اوقات کی جائے۔	
پختہ	پُ خْ تَہ	پکا۔ پکا ہوا۔ مضبوط۔ مستحکم۔ جہاں دیدہ۔	
فق	فَ ق	چہرے کا رنگ بدلنا۔ حیران پریشان۔ ہکا بکا۔	